اسلامی ترقی پسندی

علی جواد زیدی

مرتّب

الیاس شوقی

اسلامی ترقی پسندی
علی جواد زیدی

علی جواد زیدی کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ جب تک زندہ رہے اپنے پورے جوش وتوانائی کے ساتھ زندگی سے وابستگی کا مظاہرہ کرتے رہے اور زمین پر موجود زندگی کے مسائل کو اپنے غور وفکر کا موضوع بنایا۔ مادی وسائل کی ترقی نے زندگی کی آسودگیوں کا جو جادو آدمی کی نظروں کے سامنے پھینکا ہے اس کی چکا چوند میں روحانیت کہیں دب سی گئی ہے۔ انسانی جبلت اور اس کے مثبت ومنفی پہلوؤں نے جس طرح اس زمین کو جنت سے جہنم بنانے کی کوشش کی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اس پر مختلف پہلوؤں سے اربابِ فکر ونظر نے گاہے بہ گاہے روشنی ڈالی ہے۔

'اسلامی ترقی پسندی' علی جواد زیدی کی ایک ایسی ہی کوشش کا نتیجہ ہے جس میں انھوں نے مذہبِ اسلام کی تبلیغ نہ کرتے ہوئے مادیت اور روحانیت کے انسانی زندگی پر اثرات اور اس کے مثبت پہلوؤں کی نشاندہی کردی ہے۔ آج کے اس فکری اور تہذیبی انتشار کے ماحول میں مطالعے کے لیے یہ ایک اہم کتاب ہے۔

اسلامی ترقی پسندی

(مضامین)

علی جواد زیدی

مرتب

الیاس شوقی

نام کتاب : اسلامی ترقی پسندی

مصنف : علی جواد زیدی

مرتب : الیاس شوقی

سرورق : محمد فیصل صدیقی

اشاعت اول : جنوری ۲۰۰۸ء

قیمت : ۱۵۰؍روپے

ناشر : صبا زیدی : ۳۱۹/۵، ورام کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۰

E-mail Address: az110@hotmail.com

تقسیم کار

☆ قلم پبلی کیشنز

۱۷/۱۷، ایل آئی جی کالونی، پائپ روڈ کرلا (مغربی) ممبئی ۰۷۰ ۴۰۰

☆ سیفی بک ایجنسی

۵۳/ ابراہیم رحمۃ اللہ روڈ، ۱۰/۱۱/ امین بلڈنگ، ممبئی ۰۰۳ ۴۰۰

☆ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ ممبئی، دہلی، علی گڑھ

☆ دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

(یہ کتاب بھاوے پرنٹنگ پریس، ممبئی ۸، میں طبع ہوئی)

ترتیبِ مضامین

یہ تو سچ ہے کہ گزرتا ہے جو دل میں ٹھان لے
کیا غلط ہے لوگ گر زیدیؔ کو دیوانہ کہیں

پیش لفظ

فن کسی بھی فن کار کی اظہارِ ذات کا ایک ذریعہ ہوتا ہے، جس کے وسیلے سے وہ اپنی فکر اور زندگی کے تئیں اپنے تجربات کو پیش کرتا ہے۔ عام طور پر فن کار کسی ایک یا دو اصناف کو اپنے اظہار کے لیے مختص کر لیتا ہے اور اسی میں اپنی ہنرمندی کی مثالیں پیش کرتا رہتا ہے۔ ایسے فن کار بہت ملیں گے جنھوں نے مصوری یا سنگیت یا شاعری یا افسانہ نگاری کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنا کے اس میدان میں خوب شہرت اور نام کمایا ہے اور اپنے فن کا نادر نمونہ پیش کیا ہے۔ لیکن بعض فن کار ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اظہار کے لیے کوئی ایک یا دو وسیلہ ناکافی ہوتا ہے اور وہ مختلف اصناف کے ذریعے اپنی ہمہ جہت شخصیت کے الگ الگ پہلوؤں کو لوگوں کے سامنے لاتے ہیں۔ علی جواد زیدی بھی ایک ایسی ہی شخصیت تھے، جو اپنی ہمہ جہتی میں اپنی مثال آپ تھے۔ نظریاتی طور پر وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے اور اس تحریک کے ابتدائی دنوں میں اس کے سرگرم ممبروں میں سے تھے۔ دراصل ترقی پسند تحریک کا آغاز جس زمانے میں ہوا تھا وہ عالمی سطح پر ایک زبردست تبدیلی کا خواہاں تھا۔ انسانی سماج میں استحصال کا سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے اور آج بھی جاری ہے، لیکن اس استحصال میں سب سے زیادہ مذہب کو بطور حربہ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اس

لیے اُس وقت مذہبی نظریوں اور عقائد میں ترمیم کی ایک لہر بھی چلی۔ ہوا یوں تھا کہ ترقی پسندی پر جس طرح مارکسیت غالب آ گئی تھی اس نے ابتدا میں ہمارے پڑھے لکھے طبقے کو بہت متاثر کیا تھا اور مارکسی نظریے نے چوں کہ سرے سے مذہب کی تردید کردی تھی اس لیے ہمارے تقریباً تمام ترقی پسند ادیبوں نے اپنے ترقی پسند ہونے کے جوش میں خود کو بھی لامذہبیت کے حوالے کر دیا تھا۔ جو اس کی جرأت نہ کر سکے انھوں نے بھی کم از کم مذہب بیزاری کا رویہ تو اپنا ہی لیا تھا۔ لیکن دوسرے ترقی پسندوں سے علی جواد زیدی کے خیالات قدرے مختلف تھے۔ وہ اس مذہبی شدت پسندی کے خلاف ضرور تھے جس نے مسلمانوں کو ایک خول میں بند کر دیا تھا، تاہم انھوں نے مذہبی عقاید کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ وہ دنیا میں ہوتی ہوئی ترقی کی رفتار کے ہم رکاب ضرور ہونا چاہتے تھے لیکن لامذہبیت کی قیمت پر نہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ جہاں ان کا مطالعہ ہمہ جہت صفات کا حامل تھا وہیں سیاست اور مذہبیات پر بھی ان کی نگاہ گہری تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ہر موضوع پر لکھا۔ شاعری، افسانہ نگاری، تنقید، شخصیات پر خاکہ نما مضامین اور علمی و ادبی مضامین کثیر تعداد میں تحریر کیے۔ ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ستر (۷۰) ہے۔ انھوں نے شاعری کی تو اس کے سات مجموعے شائع ہوئے۔

تحقیق و تنقید، ادب میں ایک ایسا میدان ہے جہاں آتے ہی اچھے اچھوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ یہاں ادیب کی دقتِ نظر اور جانفشانی کا ایک طرح سے امتحان ہوتا ہے۔ اسی لیے اس میدان میں کم ہی ٹک پاتے ہیں۔ تخلیقی ادب میں دیکھیے آپ کو سیکڑوں ہزاروں مل جائیں گے لیکن تحقیق و تنقید کے سمندر کے پیراک کم ہی ملیں گے۔ علی جواد زیدی نے اس میدان میں بھی اپنی محنت اور جانفشانی کا نمایاں نقش چھوڑا ہے۔ تاریخِ ادبِ اردو، دو ادبی اسکول، فکر و ریاض، مطالعۂ مالک رام، اسلامی ترقی پسندی وغیرہ ان کے اہم کام ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مسلم حکومتوں کے زوال کے ساتھ اسلام سے متعلق غلط فہمیوں اور جن منفی تصورات نے دنیا میں رواج پایا اس میں مغرب پرستی کو سب سے زیادہ دخل رہا ہے۔ مغرب میں ہونے والی مادی ترقیوں نے ساری دنیا کی نگاہوں کو چکا چوند کر دیا تھا۔ دھیرے دھیرے عیش و عشرت اور نشاط آفرینی ہی انسان کے لیے مقصدِ زندگی بن گیا اور اس کے حصول کے لیے انسانی معاشرے کی وہ صالح اقدار پامال ہونے لگیں جن کی مدد سے اسلام نے ڈیڑھ ہزار برس پہلے انسان کو جہالت اور بربریت کی زندگی سے نکالا تھا۔ انسانی فکر کو بدلنا اس قدر آسان نہیں ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ہر بات کے لیے کوئی نہ کوئی توجیہ رکھتا ہے۔ انسانی وحشت و بربریت کو جائز ٹھہرانے کے لیے اس کے دیوی دیوتا تخلیق کر لیے اور پوری عقیدت کے ساتھ اس جبر و ظلم کو برتتے رہے۔ دنیاوی تاریخ میں فکری و تہذیبی انقلاب لانے میں اسلام نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کی وہ ساری خوبیاں جن سے یہ مذہب عبارت ہے خود مسلمانوں میں سے غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ علی جواد زیدی نے اس نقصان کو محسوس کیا اور اس کی تلافی کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ ''اسلامی ترقی پسندی'' کا یہی جواز ہے۔ یہ اُن کی ایک ایسی ہی کتاب ہے جو اُن میں موجود اسلامی دردمندی کے ساتھ اُن کی شخصیت کے عالمانہ پہلو پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے دنیا کی عہدِ جاہلیت سے علم و ہنر کی طرف پیش رفت اور دنیا میں تہذیبی ترقی کا ایک بہت عمدہ خاکہ کھینچا ہے۔ ساتھ ہی بین السطور میں دورِ حاضرہ میں ہونے والی اخلاقی اور تہذیبی زوال آمادگی کے اسباب کی نشاندہی بھی کی ہے۔

تاریخی اور اخلاقی اعتبار سے اس میں عنوانات قائم کر کے انھوں نے پڑھنے والوں کے لیے یہ سہولت بھی پیدا کر دی ہے کہ وہ کسی موضوع سے متعلق اگر کسی بحث کو ڈھونڈنا چاہیں تو انھیں دشواری نہ ہو۔ کتاب کو ذیلی عنوانات میں تقسیم کرنے کے باوجود یہ

ایک یک موضوعی کتاب ہے۔ اس کتاب کو بہت پہلے ہی چھپ جانا چاہیے تھا لیکن جانے کیا حالات رہے کہ یہ کام التوا میں پڑا رہ گیا اور دیگر کئی پورے اور ادھورے کام کی طرح اس کتاب کی اشاعت کا کام بھی اُن کی زندگی میں نہ ہو پایا۔

علی جواد زیدی صاحب کے صاحبزادے انور زیدی نے اُن کے انتقال کے بعد یہ بیڑا اٹھایا کہ اُن کی غیر مطبوعہ تصانیف کو یکے بعد دیگرے ایک ایک کر کے شائع کریں گے۔ ''پارو، ایک منظوم افسانہ'' کی اشاعت کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جو اُن کی کوشش سے منظرِ عام پر آئی ہے۔

الیاس شوقی

چند ابتدائی معروضات

مغربی سامراج کی یورش کے ساتھ ساتھ سارے مشرق میں عموماً اور برِصغیر ہند و پاک میں خصوصاً مغرب کی فکری یلغار بھی شروع ہوئی۔ یہ اچانک حملہ سیاسی تسلط کا نتیجہ بھی تھا اور نئے علوم وفنون کی زبردست مادی فتوحات کا بھی۔ مشرق نے علوم کے جو چراغ روشن کیے تھے، اُن کی روشنیاں اس لیے ماند پڑنے لگی تھیں کہ یہاں کے دانشوروں نے بڑی حد تک غور وخوض کرنا چھوڑ دیا تھا اور زمانے کے نئے اکتسابات سے منہ موڑ کر ایک طرح کی ذہنی آرام طلبی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کچھ علما قدیم علوم میں اِس طرح ڈوب گئے تھے کہ باہر کی فکر کے وسیع اور بنیادی سرچشموں، تجربوں اور دریافتوں کی طرف نظر کرنے کو بھی بے سود یا غیر ضروری سمجھنے لگے تھے، جو صاحبانِ علم ہونے کے دعویدار تھے وہ زمانے کے تقاضوں کو پیٹھ پیچھے ڈال کر اُس فکری اجتہاد کے دروازے اپنے اوپر بند کر چکے تھے جو اسلامی تعلیمات کے فروغ کا ضامن اور مسلسل فکری ارتقا کا محافظ تھا۔ تخلیق وتجدید کی جگہ تشریح وتفسیر وتحشی و بازیافت وتذکرہ نویسی وغیرہ کی طرف زور دیا جانے لگا۔ مغربی استعمار صنعتی انقلاب اور نشاۃ الثانیہ کے جلو میں جو نئی اور منظم فکری رو لایا

تھا، اُس سے تین طرح کے ردِّعمل پیدا ہوئے۔ ایک حلقے نے سارے دریچے، روزن اور دروازے بند کرلیے اور اپنے خیال میں ایک محفوظ فکری گھیرا اپنے چاروں طرف بنا کر یہ سمجھ بیٹھا کہ اِس حصار کی داخلی دنیا تک کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ اِس حلقے نے اُن ارتعاشات کو بھی لائق اعتنا نہ سمجھا جو نئے علوم اندرونِ حصار نئے ذہنوں میں پیدا کررہے تھے۔ یہ رَو بڑھ کر سیلاب بنی تو اس حصار کے باہر جو کچھ تھا (اور بہت کچھ تھا) اُسے یا تو ڈبو بیٹھی یا تتر بتر کردیا۔ دوسرا مختصر سا حلقہ ایسے افراد کا تھا جو یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ نئے علوم کو خوش آمدید کہنا چاہیے۔ اس کا دفاعی اور جوابی ردِّعمل بہت ہلکا، محدود اور کم وقتی رہا۔ ایک تیسرا حلقہ جو وقت کے ساتھ بڑھتا ہی گیا، ایسا تھا جو اس نئی رَو میں اس طرح الجھا کہ مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہوگیا اور اپنے ماضی، اپنے ماحول اور اپنے اہم فکری سرمایے سے بڑی حد تک بے خبر ہوگیا، جو کچھ اس نے بچا کر رکھنا چاہا وہ ماضی کا مسخ شدہ چہرہ تھا اور فکری سرمایے کا ناقص، نامکمل اور نادرستی کی حد تک سرسری تصور تھا۔

برطانوی اور دوسرے قدیم مغربی استعماروں کے انحطاط کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی کی کھنچی طنابیں کچھ ڈھیلی پڑیں، جو حصار بنائے گئے تھے اُن کے دروازے بھی کھلے اور متکلمین، مفکرین اور داعیوں نے مغربی علوم بالخصوص سائنس کی روشنی کے مقابل آکر آنکھیں بند کرلینے کی عادت ترک کی اور فکری مدافعت ہی نہیں اثباتی پہلوؤں کی تبلیغ و تشہیر کی طرف رکتا ہوا قدم آگے بڑھایا۔ اگرچہ یہ اقدام اِس بار کسی قدر وسیع پیمانے پر ہوا، لیکن بنیادی طور پر مدافعانہ اور متکلمانہ ہونے کی وجہ سے نہ عام فکری سطح پر پوری طرح مؤثر ہو پایا اور نہ مثبت تخلیقی تفسیر و تعبیر کی راہیں کھول سکا۔ اس دوران میں بیرونی دنیا سے کئی فلسفیانہ لہریں ایسی بھی اُٹھیں، جنھوں نے سماج کو معاشی اور سیاسی اعتبار سے ہلا کر رکھ دیا اور اس کے نتیجے میں حکومت اور سماج کی نئے خطوط پر تشکیل ہونے لگی۔ اِن میں بھی اشتراکیت اور اشتمالیت کے نظریات بے حد انقلابی تھے اور قدیم فکر کی اساس و بنیاد

سے ٹکرا رہے تھے۔ ایک طرف استحصالی طاقتوں کے محل لرزے تو دوسری طرف عام سیاسی اور اقتصادی نظریہ ساز ہی نہیں، بلکہ مذاہب مختلفہ کے محافظین بھی اس غیر متوقع حملے سے گھبرا اُٹھے۔ اشتراکیت کا براہِ راست تصادم تو سرمایہ دارانہ نظام سے تھا، لیکن بالواسطہ عیسائی چرچ سے بھی تھا جو سامراج اور سرمایہ داری کی حفاظت کررہا تھا اور نعرہ یہ دیا گیا کہ مذاہب عوام کی افیون ہے۔ جب بات مذہب کی آپڑی تو دوسرے مذاہب بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر صف آرا ہوگئے۔ اس صف آرائی نے دو صورتیں اختیار کیں۔ زیادہ تر تو سوشلزم کے فلسفے کی غیر منہضم تنقید شروع ہوئی، لیکن اسی کے ساتھ خود مذہب نے اپنے دامن میں متوازن تعلیمات کی تلاش کا سلسلہ شروع کیا۔

دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام کے دائرے میں صورتِ حال جداگانہ تھی۔ یہاں عیسائیت کی طرح کوئی منظم چرچ یا ملاّئی نظام نہیں تھا۔ اسلامی علما ریاست کے تابع مہمل بھی نہیں تھے، جہاں کچھ علما درباروں سے وابستہ رہے ہیں وہاں تاریخ گواہ ہے کہ ایسے بھی اکابر اور علمائے دین تھے جنھوں نے سلطنتوں سے ٹکریں لی ہیں اور جلال شاہی کی فکر نہ کرکے قید و بند اور صلیب و دار کی منزلوں سے بھی گزرے اور دین کے معاملے میں مصلحت سے انکار کردیا۔ اسلام کی طاقت منظم ملائیت اور ریاست کے تال میل سے نہیں بلکہ ائمۂ مسلمین کے خلوص و اعتقاد و عمل سے حاصل ہوتی تھی۔ چاہیے یہ تھا کہ اس فکری یورش کا مقابلہ خالص فکری سطح پر ہوتا تاکہ تعلیماتِ اسلامی کی توانائی اور عصری معنویت واضح ہوجاتی اور مثبت طریقے سے فکرِ اسلامی کی تعبیر جدید کی جاتی جس سے فکر کی سطح پر دعوت نظر اور تبادلۂ خیال اور جدال فکری نتیجہ خیز ہوتی، لیکن ہوا یہ کہ ہم بھی چرچ کی پیروی میں مدافعانہ اور خالص منفی اور مناظرانہ طریق کار کو اپنانے لگے، اس میں بات اُلجھتی ہی گئی اور حقیقت کا سرا نہ مل پایا۔ سب سے اہم اقدام یہ ہونا چاہیے تھا کہ سیاسی اور اقتصادی سطح پر جو نئے رجحانات اُبھرے تھے (بشمول اشتراکیت و

اشتمالیت) اُن کے تمام تاریخی اور نظریاتی عوامل ومحرکات پر نظر رکھتے ہوئے اسلام اور
قبل اسلام کے نظریاتی اور تاریخی عوامل ومحرکات کو اس طرح تولا، پرکھا اور پیش کیا جاتا کہ
اسلام کا ترقی پسندانہ کردار اُجاگر ہوتا، لیکن ناقص دینی نظام تعلیم کی بدولت اِن اُلجھے
ہوئے، بکھرے ہوئے اور فروغ پائے ہوئے مسائل کے مالۂ و ماعلیہ کا احیا اُن اربابِ فکر
کے بس کی بات نہیں تھی جن پر زمانے نے اس جہادِ فکر کی ذمہ داری ڈال دی تھی۔

خوشی کی بات ہے کہ پچھلی چند دہائیوں میں صورتِ حال خاصی رفتار سے
بدلنے لگی ہے۔ اسلامی تعلیمات کا مثبت اور معروضی جائزہ ہمدردانہ وسعتِ نظر کے ساتھ
شروع ہوا ہے اور اسلامی مفکرین کی نئی نسل از سرِ نو متوجہ ہو رہی ہے۔ اسلام کے خلاف
مغربی مخالفین نے جو غلط تاثرات پھیلائے ہیں، اُن پر جذباتی طور سے برہم ہونے کی
بجائے اُن غلط فہمیوں کو عقل و دانش، تاریخی حقائق اور ٹھوس ثبوت کے ساتھ دور کرنے کی
کوشش کی جارہی ہے تاکہ دھند چھٹے اور اسلام کی سیرت کا نور اپنی چمک دکھا سکے۔ اس
تبلیغی کوشش کا نشانہ مخالفین سے زیادہ ہماری وہ نئی نسلیں ہیں جنھیں مدتوں سے اپنے
محبوب مذہب کے بارے میں، ہم عصر شکوک و توہمات و ترجیحات ذہنی نے ناواجب
تصورات سے اُوپر اُٹھنے کا موقع نہیں دیا ہے۔ یہ موقع ہم اس طرح فراہم کریں کہ وہ
از سرِ نو حقائق کو جانیں، پرکھیں اور خود سے یہ محسوس کرنے کے قابل ہو سکیں کہ ادھوری، نیم پختہ
اور غیر منصفانہ روایات اور مسخ شدہ افکار نے اُنھیں کس طرح دھوکا دیا تھا۔ اسلامی مدارس
کے نصابی نظام میں بھی آہستہ روی کے ساتھ تبدیلیاں ہونے لگی ہیں اور جدید محرکاتِ فکری
کے اہم سرچشموں تک پہنچنے کے امکانات نظر آنے لگے ہیں۔ ہمارے سامنے نئے آفاق،
نئے اکتسابی مراحل اور نئے تخلیقاتی اور تعبیراتی امکانات دور دور تک پھیلتے جارہے ہیں۔
یہ اسلامی فکر کے افہام و تفہیم اور فروغ کے لیے ایک نیک فال ہے۔ اس سے مذاہب
کے تقابلی مطالعے میں بھی آسانیاں فراہم ہوں گی اور تاریخی تسلسل کے منظرنامے میں

اسلام انسانی ہمدردی اور آفاقی برادری کے پیامبر کی شکل میں سامنے آئے گا۔ اس سے
ایک فائدہ یہ بھی متصور ہے کہ خود مسلمانوں کے اندر جو معمولی معمولی باتوں پر مجادلہ جاری
رہتا ہے اور جسے تیزی سے گزرتی ہوئی صدیاں بھی ختم کرنے میں ناکام رہی ہیں، اُس
کے ختم کرنے کی طرف معنی خیز قدم اس طرح اُٹھایا جاسکے گا کہ فروعی باتوں سے ہٹ کر
بنیادی اور اصولی تعلیماتِ اسلام پر جمیں گی۔ یہ ساری کوششیں انسان کو انسان کے قریب،
ہم وطنوں کو ہم وطنوں کے قریب اور دنیا بھر کے انسانوں کو آفاقی حقائق سے دوچار
کرانے میں مدد ومعاون ہوں گی۔ یہی اسلام کا سیکولر رویہ اور آفاقی نقطۂ نظر ہے۔

اسلام کی بزرگی اس سبب سے نہیں ہے کہ دوسرے چھوٹے یا جھوٹے ہیں،
بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ پیچ در پیچ مادّی اور فکری مسائل کا ایک فطری اور صالح حل بن کر
ہمارے سامنے آیا ہے اور اس نے ارتقا کی راہ میں صدیوں سے اہم ترین کردار نبھایا ہے۔
تاریخ کے اعتبار سے اسلام کو بیشتر جدید نظریات پر سبقت زمانی حاصل ہے۔ سوشلزم تو
صدیوں بعد کی چیز ہے۔ ان صدیوں میں دنیا بدل چکی تھی، تاریخی عوامل ومحرکات بدل
چکے تھے۔ اسلام کو جن سیاسی، اقتصادی اور فکری مخالفتوں کا سامنا تھا وہ آج سے بہت
مختلف تھیں۔ اس فرق واختلاف کو نظر میں رکھے بغیر تیرہ سو برس پہلے کی تعلیمات کی اصل
روح کو اور اِن تعلیمات کے محرکات کو کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟ لیکن فرق زمانی کے باوجود،
حالات و مسائل میں بہت سی مماثلتیں بھی ہیں۔ ان مماثلتوں کی چھان بین بھی ضروری
ہے کیوں کہ بعض اوقات جزئیاتی اختلاف بھی کمیت ہی کو نہیں کیفیت کو بھی متاثر کرتا
ہے۔ بہرحال، ملتی جلتی صورتوں میں جو حل اُس وقت ڈھونڈے گئے تھے وہ حاشیائی
تطابق و انحراف کے ساتھ آج بھی بالکل اجنبی نہیں ہیں۔ اس سے یہ بدیہی نتیجہ نکلتا ہے
کہ ان اسلامی تعلیمات میں قائم بالذات ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ ان کی انفرادی
حقیقت آج بھی مفید مطلب اور کسی نہ کسی شکل میں برمحل ہے۔ پھر ہم ان تعلیمات کی نئی

تشریح وتفسیر وتعبیر کے ساتھ ازسرِ نو بازیافت کیوں نہ کریں؟ اور جواب اور جواب الجواب کی الجھنوں میں کیوں اور کہاں تک اُلجھے رہیں۔

اسلام کی ابتدائی امتحانی منزلوں میں، سخت ترین مخالفتوں کے باوجود، اہلِ کتاب اور ان کی تعلیمات کو کبھی منفیانہ نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا گیا بلکہ مثبت طریقے سے یہ ظاہر کیا گیا کہ سابقین بعض اوقات کس انحرافات میں مبتلا ہوئے اور کبھی کبھی راہِ مستقیم سے بھٹک بھی گئے، ورنہ اپنے اپنے زمانے میں وہ بھی انبیا کے بتائے ہوئے راستوں پر تھے اور اصل اصول میں متحد تھے۔ اسلام نے انبیائے سابقین کی عزت وعظمت میں فرق نہیں آنے دیا بلکہ اُن کے متبعین کو بھی جو مخالفت میں کھل کر سامنے آگئے تھے لکم دینکم ولی دین (تمھارے لیے تمھارا دین اور ہمارے لیے ہمارا دین) کہہ کر نئے خطوط پر سوچنے کی دعوت دی۔ اسلامی تبلیغ ودعوت کی تاریخ میں یہ منزل بہت اہم ہے۔ آج نئے نظریوں کی جانچ کرتے وقت اسلام کی تعلیمات پر جس مثبت، معروضی اور علمی وفکری انداز میں گفتگو ہو رہی ہے، اس کا سرچشمہ یہی روایت ہے اور یقیناً لائق ستائش ہے۔

زیرِ نظر مختصر سی کتاب ایسے موقع پر سامنے آرہی ہے جب سوشلزم اور کمیونزم کے سب سے بڑے مرکز میں ان جدید ترین نظریات کی بنا پر قائم طرزِ حکومت کا خاتمہ خود اس کے بانیوں کے ورثا کے ذریعے عمل میں آچکا ہے۔ یہ یکایک نہیں ہوا بلکہ اس نظام کی بنیادی خرابیوں اور خود کمیونزم کے طرزِ فکر اور طریق کار پر اندر ہی اندر خود احتسابی کی ایک مہم کا آغاز ہو چکا تھا۔ آخرکار ''پروسٹورویکا'' (تعمیرِ نو) اور ''گلیسناٹ'' (کھلاپن) جیسی حکمت عملیوں کا اختیار کیا جانا، گورباچاف کے دورِ حکمرانی میں پسپائی کی طرف آغازِ سفر کا اعلان تھا۔ بورس یلتسین، صدر روس کے عہد میں کھلے بازار کی معیشت کی بے باک روی کے اقدامات شروع ہو چکے ہیں۔ پورے نظام کی شکست معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اس نے دنیا کے تمام اربابِ فکر کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہٹ دھرمی سے اظہارِ فکر کا اور تنگ نظری

سے تجزیہ وتنقید کا سدِّ باب ناممکن ہے۔ صرف طاقت کے بل بوتے اور کورانہ تقلید پر اصرار کرتے رہنے سے کسی نظامِ فکر میں پیدا ہونے والی دراڑوں کی وقتی لیپ پوت تو ہو سکتی ہے، لیکن اصل عمارت کے اندر پوشیدہ انہدام کو روکا نہیں جا سکتا۔ نظامِ فکر کی بوسیدگی عام عمارتوں کی بوسیدگی سے مختلف ہے۔ فلسفۂ اجتہاد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بیرونی لیپ پوت کی بجائے روحِ فکر کی بازیافت کا عمل ہے اور یہ بازیافت حرکیاتی، ارتقائی اور ناقابلِ تردید عمل ہے جو فلسفوں اور فکروں کے آفاقی اور انسانی پہلوؤں کو تسلسل واستمرار عطا کرتا ہے۔ آمرانہ طریق کار میں کسی اجتہاد کی گنجائش نہیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں ناپختہ انحرافات کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ روس میں آج اسی تاریخ کا اعادہ ہو رہا ہے۔ وہاں آج بھی سوشلزم کا نام لیا جا رہا ہے لیکن یہ ہزیمت کو چھپانے کی ناکام کوشش ہے۔ اشتراکی اور اشتمالی نظریہ ساز کو وقت پر اڑے رہنے کی بجائے پہلے ہی سے نئے خطوط پر سوچنے کی دعوت دے چکا تھا اور ماضی قریب میں نئی سوچ کی کشمکش ایک اور عالمی پیمانے کا انقلاب جلد ہی سامنے آنے والا تھا۔ یہ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ایک طوفان ہے جس میں سماجی اور اقتصادی ہی نہیں روحانی مزعومات تک متاثر ہو جانے والے ہیں۔ گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے لاکھوں افراد اس سے باقاعدہ طور پر وابستہ ہو چکے تھے، جو باقاعدگی سے وابستہ نہیں تھے ان کی سوچ پر بھی اس کی پرچھائیاں دیکھی جا سکتی تھیں۔

اس دور میں علمائے اسلام کا طریق کار لائق غور وفکر ہے۔ وہ پہلے تو اسلام میں مغربی طرز کی جمہوریت تلاش کر رہے تھے اور اب دفاعی انداز میں تعلیماتِ اسلامی کے کمیونسٹ اور سوشلسٹ سوتوں کا سراغ لگانے میں مصروف تھے۔ یہ گاڑی کو آگے اور گھوڑے کو پیچھے رکھ کر سفر کرنے کے مترادف تھا۔ چاہیے یہ تھا کہ ہم اسلامی تعلیمات کا ازسرِ نو تجزیہ کر کے مفکرینِ عالم کو بتاتے کہ اسلام میں وہ کون سے ترقی پسند عناصر ہیں جنھوں نے تقریباً چودہ سو برس پہلے عالمی معاشرے کو سماجی اور اقتصادی سطح پر دنیا کے

سب سے پہلے اور سب سے بڑے انقلاب فکری سے کس طرح آگاہ کیا اور ایک نئے
ترقی پسندانہ سماج کے تشکیل کی دعوت دی۔ آخر یہ تو واضح حقیقت تھی کہ تصور اشتراکیت
کے وجود میں آنے سے تیرہ سو برس پہلے اسلام اذہان عالم کو جھنجھوڑ کر صدیوں کے خواب
سے بیدار کر چکا تھا۔ پھر یہ حضرات اسلام میں سوشلزم کیوں ڈھونڈتے تھے، سوشلزم میں
اسلام کی جستجو کیوں نہیں کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ نتائج یکساں یا تقریباً یکساں ہوتے،
لیکن تاریخی رو کے سمجھنے میں آسانی ہوتی اور اس کا پتہ چل جاتا کہ کہاں کہاں ذہن انسانی
نے ٹھوکر کھائی ہے۔ طریق کار کی نامناسبت کی وجہ سے فکری اور عملی سطح پر جس پیش رفت
کا آغاز ہو چکا تھا وہ رک گئی۔

اس نئے طریق کار میں یہ ضروری ہوتا کہ طلوع اسلام کے وقت عرب کے
جزیرہ نما کے سماجی اور اقتصادی حالات کا مختصر مگر ہمہ گیر جائزہ لیا جائے۔ جب ہم یہ کہتے
ہیں کہ اسلام میں سماجی، سیاسی اور اقتصادی غرض زندگی کے تمام تصورات شامل ہو جاتے
ہیں، تو دین کا تصور کلّی طور پر ایک اکائی کی حیثیت سے ہمارے پیش نظر ہوتا ہے یعنی یہ
دین بیک وقت روحانی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے رہتا ہے۔
کسی وقت بھی اس کلی تصور سے اس کے کسی جز کو جدا نہیں کیا جانا چاہیے۔ دوسرے لفظوں
میں دین کو مکمل طور پر معاشرے سے الگ کر دینا ممکن نہیں ہے۔ تحقیق طلب امر یہ ہے کہ
معاشرے اور دین کی اس نزدیکی یگانگت کی نوعیت اور اس یگانگت کو استوار بنیادوں پر
برقرار رکھنے کا طریقہ کیا رہا؟ دین کے سچے ماننے والے (مومن) کے لیے زبان سے
اقرار، قلب سے تصدیق اور ارکان پر عمل ضروری مانا جاتا ہے۔ تقریباً سبھی مذاہب کے
ماننے والوں کی پرکھ بھی ہوتی ہے۔ چونکہ اسلام کے ارکان دین میں زندگی کے سبھی
پہلوؤں کا احاطہ کر لیا جاتا ہے، اس کے کسی ایک رکن سے قطع نظر ممکن نہیں ہے، ورنہ دین
کا کلی تصور ہی مفقود ہو جائے گا۔ یقینِ کامل بنیادی نقطہ ہے۔ اس یقین کامل کا سرچشمہ

ذاتِ محمدی ہے، جن کے ذریعے محکم نظام قرآنی ہم تک پہنچا ہے۔ لَا رَیْبَ فِیْهِ (اس
میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں) اور پھر سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ ہے۔ اس کا اتباع
بھی لازم ہے اور سنت پر یقین بھی ضروری ہے، لیکن قرآن کریم کی طرح یہ دو دفتیوں کے
درمیان ایک مکتوب ومحفوظ کتاب نہیں ہے۔ اس لیے سنت کیا ہے، اس کی جانچ اور پرکھ
کے لیے روایت اور درایت کے اصول وضع ہوئے۔ اس منزل پر یقین کے ساتھ عقل وفہم
کے سہارے تدبر ضروری ہوا۔ قرآن مجید میں صاف صاف بتا دیا گیا کہ "ہم نے آپ پر
مبارک کتاب اس لیے نازل کی کہ لوگ اس کی آیات پر غور وفکر کریں۔" (کِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ
اِلَیْكَ مُبَارَكٌ لِیَدَّبَّرُوا اٰیَاتِهٖ... ص:۲۹) اس تدبر کے آئینے میں قرآن وسنت پر
یقین کے ساتھ تصدیق وتائید لبی بھی حاصل ہوتی ہے، لیکن ارکان پر عمل اہم ہے۔ ان
ارکان میں دین کا روحانی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی غرض کہ پورا نظام آ گیا۔ یہی دین
کے کلی تصور سے ہمیں آشنا کراتا ہے اور ہمارے کردار وافکار کی راہیں متعین کرتا ہے۔
ظاہر ہے کہ اسلام نے جو راہیں اس وقت متعین کیں، قبل اسلام کے عرب سماج کی
حالت کو بھی مدنظر رکھا اور اس میں اصلاح کی طرف اس طرح قدم بڑھایا کہ انسانی سماج
کی ضروریات اور سمتِ ترقی بھی سامنے رہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ طلوع اسلام کے
وقت عرب سوسائٹی کی کیفیت پر ایک جھلکتی سی نظر بھی ڈالی جائے، کیونکہ تعلیمات کے
خالص مذہبی اور روحانی پہلوؤں کے ساتھ سماجی، سیاسی پہلوؤں کو ذہن میں رکھے بغیر اس
نئی پیش رفت کی اہمیت واضح نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ ان دونوں پہلوؤں کے مابین گہرا ربط
ہے۔ اس وقت معاشرے کو جن چیلنجوں کا سامنا تھا اس کا اسلام نے کس طرح مقابلہ کیا؟

تقریباً سارا جزیرہ نما عرب ریگستانی تھا، اس لیے یہاں کا فطری طرزِ زندگی
خانہ بدوشی اور گلہ بانی تھا۔ خانہ بدوشی کی زندگی مسلسل حرکت کی زندگی ہے جو کبھی تو سست
ہوتی اور کبھی ایک دم سے تیز ہو جاتی اور اس حرکت کی محرک چراگاہ کی تلاش یا پھر جائے پناہ

کی جستجو ہوتی۔ امن ہو یا جنگ عرب کو متحرک رہنا ہی پڑتا۔ اونٹ کو غالباً عیسیٰؑ سے دو ہزار برس پہلے پالتو جانور بنالیا گیا تھا اور وہ بار برداری اور زندگی گزارنے کا ذریعہ بن گیا۔ عرب اونٹ کے بغیر تصور میں نہیں آسکتا تھا۔ بارش میں وہ سرسبز علاقوں کی طرف رُخ کرتا اور خشک سالی پر اُن مستقل کنوؤں سے چمٹا رہتا جہاں کچھ ہریالی رہتی۔ کہیں کچھ غلہ بھی پیدا ہوتا، لیکن کھجور ہی خاص فصل تھی اور کھجور کی ہر چیز کام میں آتی۔ کھجور اور اونٹنی کا دودھ بدوؤں کی خاص غذا تھی۔ قبیلے شاخوں پر مشتمل ہوتے جو باپ دادا کے نام پر چلتے، جیسے بنی اسد وغیرہ۔ یہ شاخیں باہمی رشتوں سے منسلک ہوکر اجزائے قبیلہ ہی ہوتیں اور انھیں خونی رشتوں کی حیثیت حاصل تھی۔ بعض قبائل ایک دوسرے کے حلیف بھی ہوجاتے تھے۔ قبائل میں موالی بھی ہوتے تھے اور غلام بھی۔ غلام یا تو جنگی قیدی ہوتے یا خرید اور عطیے کے ذریعے حاصل کیے جاتے۔ انھیں معاشرے میں کم تر درجہ دیے جانے کے باوجود ایک طرح کی مساوات بھی حاصل ہوتی۔ عرب میں خونریزیاں عام تھیں۔ یہ جنگیں یا تو قتل کے نتیجے میں ہوتیں یا تجارتی قافلوں کی لوٹ مار پر اور مدتوں چلتیں جن میں کافی جانیں تلف ہوتی تھیں۔

اسلام کے پہلے ہر قبیلے کا جداگانہ محافظ یا محسن ہوتا تھا اور اس کی تقریباً پرستش ہوتی تھی۔ عرب میں تین دیویاں تھیں: لات، منات اور عزیٰ، جنھیں خدا کی بیٹیاں سمجھا جاتا تھا۔ منات قسمت کی دیوی تھی۔ ساحلوں کے کنارے اس کی عبادت گاہیں تھیں۔ جادوٹونے عام تھے۔ فال نکالنے کا بھی رواج تھا۔ نظر بد سے ڈرتے تھے اور حفاظت کے لیے تعویذ پہنتے تھے۔ قبائل کے جداگانہ محافظین اعلیٰ یا دیوتاؤں کے علاوہ عربوں کے یہاں ایک ایسی طاقت کا تصور بھی موجود تھا، جو اِن قبائلی دیوتاؤں سے بالاتر اور قوی تر تھا۔ نسبی سلسلہ پدری تھا لیکن اوس اور خزرج قبیلوں میں بنومغلہ وغیرہ مادری نسبی سلسلوں کا پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ کم از کم مدینے میں مادری سلسلہ بھی پہلے سے موجود تھا۔ ایک

عورت کے کئی کئی شوہر ہونے کا سلسلہ اسلام کی ابتدا کے پہلے تک عرب میں جابجا موجود تھا، لیکن پدری سلسلہ عام تھا پھر بھی کئی طرح کی شادیوں کا رواج عام تھا اور ان تضادات کا وجود بھی باہمی اختلافات اور جھگڑوں کی بنا بنتا تھا۔

لڑکیوں کا قتل عام تھا۔ لڑکیوں کی پیدائش پر باپ کے چہرے سیاہ پڑ جاتے تھے۔ وہ پیدا ہوتے ہی دفن کردی جاتی تھی۔ کبھی کبھی پانچ چھ برس تک زندہ رہنے دی جاتی اور پھر اس کو جلوس کے ساتھ لے جاتے اور کسی اندھے کنویں میں ڈھکیل دیتے کہ موت کا لقمہ بن جائے۔ بنی تمیم کے قیصر نے اپنی سبھی بیٹیوں کو اسی طرح موت کے منہ میں ڈھکیل دیا تھا۔ تعجب اس پر ہوتا ہے کہ جو عرب کسی ایک فرد کے خون پر مدتوں جنگ کرسکتا تھا، وہ بچیوں کے ایسے قتل عام پر بالکل ساکت وصامت رہتا۔ مائیں بھی کیسے خاموش ہوجاتی تھیں، جبکہ بدلہ لینے کے لیے عورتیں انسان کا خون پی لیتی تھیں اور اس کے اعضائے جسم کا نوالہ بنالیتی تھیں۔ اس سلسلے میں ہندہ زوجۂ ابوسفیان کا واقعہ مشہور ہے کہ اس نے شہدائے بدر کے کانوں اور ناکوں کے ہار پہنے تھے اور حضرت حمزہؓ کا جگر چباڈالا تھا، لیکن اسی کے ساتھ عرب میں بڑھتی ہوئی تجارت کی رَو کا تقاضا تھا کہ ایسی بہیمانہ عادات کا خاتمہ ہو اور قبل اسلام بھی اس صورت کے خاتمے کی ضرورت کا احساس اُبھر رہا تھا۔

قبائلی زندگی کے ان پہلوؤں کے ساتھ عربوں کے مثبت اکتسابات میں ان کی بہادری، مہمان نوازی، غریب پروری اور احساس شرافت نسبی وغیرہ کے علاوہ شاعری اور خطابت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ قبل اسلام کے زمانے میں جسے عرف عام میں دورِ جاہلیت کہا جاتا ہے، شاعری اور خطابت کے اعلیٰ ترین نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ شاعری کی بدولت قدیم عرب کی تاریخ کا بہت سا حصہ بچ رہا۔ اسی شاعری سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ جہاں وہ بے دردی سے جنگ میں خوں بہا دیتا تھا وہاں وہ بے پناہ محبت

کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا تھا۔ اجنبیوں اور مہمانوں پر مہربان ہوتا تھا اور عورتوں اور کمزوروں پر ہاتھ اُٹھانے کو عیب سمجھتا تھا۔

جنوبی عرب میں شہری زندگی پنپ رہی تھی، جہاں تجارتی کارواں رکتے تھے یا ساحلوں پر چھوٹے چھوٹے شہر بننے لگے تھے۔ بالخصوص وہ ساحل چمکا جہاں ہندوستان اور افریقہ سے تجارت ہوتی تھی۔ اس طرح بازاروں کی عرب زندگی میں خاصی اہمیت ہوتی جارہی تھی۔ شہروں اور تجارتی مرکزوں کو ملانے کے لیے کارواں سرائیوں، سڑکوں اور عمارتوں کی طرف بھی دھیان دیا جانے لگا۔ معمار جنوبی یمن یا حضرموت سے آتے تھے۔ ان شہروں میں عرب کی مذہبی اقلیتیں مثلاً یہود و نصاریٰ اور غیر عرب عناصر آباد ہورہے تھے اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہنے کی وجہ سے آپس میں معلومات و خیالات کا تبادلہ بھی ہوتا رہا تھا۔ شہروں میں سب سے اہم اور نمایاں مکہ اور یثرب (مدینہ) تھے۔ ہجرت سے پہلے تک مکہ ہی کو مرکزیت تام حاصل تھی، لیکن ہجرت کے بعد یثرب یعنی مدینہ شہر خاص بن گیا، لیکن مکہ کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ اسلام کی تاریخ میں مکہ کے بے جنگ فتح کو نمایاں مقام حاصل ہے پھر کعبۂ مقدس کی نوعیت بدل گئی اور ایک نئی اور مستقل بین الاقوامی مرکزیت کا نمائندہ بن گیا۔

شہری زندگی کی ابتدا نے عرب کے شمال و جنوب ہی کو باہم مربوط نہیں کیا، بلکہ ایران، بازنطینہ، بلکہ جنوبی عرب کے یمن اور حضرموتی ثقافت سے بھی قریبی تعلق پیدا کیا۔ یہ افریقی اور ہندوستانی ساحلی شہروں سے بھی آشنا ہوئے کیونکہ تجارتی حرکت میں تیزی آنے سے چھوٹے چھوٹے عرب شہر بھی ان علاقوں اور ثقافتوں سے آشنا ہوئے، جو تجارتی مراکز عرب میں قائم ہورہے تھے وہاں خلیج فارس (خلیج عرب) سے موتی، ریشم، سوتی کپڑے، چاول اور مرچ ہندوستان سے، غلام، بندر، سونا اور شتر مرغ کے پر مشرقی افریقہ سے منگائے جاتے تھے اور بحیرۂ روم کے علاقوں کی پیداوار کی بھی بڑی کھپت

ہورہی تھی۔ ان مراکز کو تحفظ، قرض، ایجنٹوں، حساب کتاب کی لیاقت وغیرہ اور تحریری زبان کی بھی ضرورت تھی۔ مکہ میں سب سے بڑی تجارتی منڈی تھی جہاں مختلف ملکوں، قبیلوں، مذہبوں اور ثقافتوں سے لوگ مختلف خیالات لے کر آتے تھے، یہاں توحید کی آواز بلند ہوئی، یہاں بہت سے خداؤں اور بتوں کا انکار ہوا، یہاں نئی سماجی سمتوں میں سفر شروع ہوا۔ اس لیے یہیں سے مخالفتوں کی ابتدا بھی ہوئی اور یہیں سے چند نفر پہلے پہل دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

مخالفتیں اتنی بڑھ رہی تھیں کہ مکہ میں قیام ناممکن ہوگیا، لیکن نئی تعلیم کا اثر بھی اتنا بڑھ رہا تھا کہ غفار قبیلے اور مدینہ بلکہ ایران تک سے لوگ کھنچ کھنچ کے آنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ مکہ سے ہجرت کا فیصلہ کرنا پڑا۔ مکہ میں لوگ ہم قبیلہ تھے۔ مدینہ میں نسبتاً اجنبی، لیکن وہاں دائرۂ اثر بھی بڑا تھا اور لبیک کہنے والوں کا مجمع بھی زیادہ متنوع تھا۔ اسی سے ظاہر ہے کہ اسلام کا پیغام اگرچہ پہلے پہل مکہ میں سنایا گیا، لیکن اس کے مخاطب ''عالمین'' تھے اور اس پیغام کو اطراف میں پھیلانے کی باقاعدہ کوشش کی گئی۔ اس پہلو سے دیکھیے تو ابتدائی ہجرتِ حبشہ بھی اسی پیغام رسانی کے عالمی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

اس وقت کے حالات کو سدھارنے کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ نے ایک ایسا منظم و مرتب لیکن لچک دار نظامِ فکر و عمل مرتب کیا جو جزیرہ نمائے عرب کی سماجی اور اقتصادی ضروریات کا احاطہ تو کرے ہی، لیکن رہبرانہ اصول وضوابط ایسے وضع کیے جو زمانے کے گرم وسرد اور اتار چڑھاؤ کو جھیل سکیں اور ان میں ردو انجذاب کی ایسی صلاحیتیں موجود ہوں کہ انقلابِ زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے باقی رہ سکے۔ یہ صرف پیغام دینے اور بات منوانے کا سوال نہیں تھا بلکہ ان اصولوں پر خود عمل کرکے بتادیا اور اپنے ساتھیوں سے عمل کراکے دکھادیا کہ یہ خیالی جنت نہیں ہے، بلکہ لائق عمل اور قابل حصول واضح نتائج کی حامل تنظیم ہے اور اس سے صورتِ حال بہتر بنائی جاسکتی ہے۔ یوں تو اسلام نے زندگی کے

ہر شعبے کے بارے میں سوچا اور بتایا ہے لیکن اس کتابچے میں ان سب پر اظہارِ خیال نہ ممکن ہے اور نہ میرا مقصود۔ میں نے صرف ان پہلوؤں کو لیا ہے جن کا اثر عرب ہی نہیں دنیا کے بیشتر حصوں پر پڑا اور جو آج بھی کئی حیثیتوں سے ہدایت کی مشعلیں فراہم کر رہے ہیں۔

اوپر سرسری طور سے سوشلسٹ اور مارکسی نظریات کی بات بھی آ گئی ہے۔ دو چار موٹے موٹے لفظوں میں اس کی طرف بھی اشارہ مقصود ہے، کیونکہ اب سے کچھ دنوں پہلے تک یہی جدید ترین نظریۂ اقتصاد و زندگی سمجھا جاتا تھا۔ سوشلزم کے اقتصادی اور سماجی نظام میں طریقِ کار نہ تھا کہ اقتصادی سطح پر ریاستی کنٹرول کے ذریعے سماج کی تنظیم جدید کی جائے تا کہ باہمی مقابلے کی جگہ باہمی تعاون لے لے اور محنت کا اجر اور زندگی کی خوشیاں مناسب طور پر تقسیم ہو سکیں۔ پیداوار پر سب سے مقدم حق پیداوار کے وجود میں لانے والوں یعنی محنت کشوں کا ہے۔ اس کی طرح طرح سے تعبیریں کی گئی ہیں اور اس کے ایک سرے پر کمیونزم اور دوسرے سرے پر ترقی پسند سیرلزم بھی سوشلزم کی وارث بنتی ہے۔ کمیونزم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ساری دولت محنت کے ذریعے ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اس ساری دولت پر مزدوروں اور محنت کشوں ہی کا حق ہے۔ اس نظریے کے ماتحت سرمایہ داروں کے لیے نہ کوئی جگہ ہے اور نہ ان کے لیے کچھ بھی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ طبقاتی جنگ ہے۔ مارکس کے تصور میں ایک ایسا دور آنے والا تھا جب ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے گا اور ہر ایک سے اس کی حیثیت اور اہلیت کے مطابق کام لیا جائے گا اور آخر کار ریاست مرجھا کے ختم ہو جائے گی۔ یہ پورا نظام سرمایہ داری کے ردِ عمل کے طور پر ابھرا ہے۔ ظاہر ہے کہ عرب میں اس طرح کا سرمایہ دارانہ نظام نہ طلوعِ اسلام کے پہلے تھا اور نہ اس کے بعد، لیکن مالک و آجر کا فرق تھا، غلام و مالک کا فرق تھا۔ حقِ ملکیت کا سوال تھا، عورت و مرد کے حقوق کا سوال تھا، بنیادی مساوات کا سوال تھا۔ ریاست کا وہ تصور بھی اس وقت مفقود تھا جو مارکس کے زمانے میں سرمایہ دارانہ نظام کے ماتحت اُبھر چکا

تھا۔ پھر بھی بیت المال وغیرہ کے تصورات تشکیل پا چکے تھے اور تقسیم دولت کا سوال بھی سامنے آ چکا تھا، جو تصورات اور حالات سامنے تھے ان کو اور نزدیک و دور کے ماحول کو دیکھتے ہوئے اسلام نے حیرت انگیز طور پر ترقی پسندانہ تصورات اپنائے۔ اس کتاب میں انھیں میں سے چند تصورات کسی قدر تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں تاکہ قارئین یہ اندازہ لگا سکیں کہ اسلام کی مقبولیت اس کے انقلابی اقدامات و تصورات کی بدولت تھی۔ یہ تصورات بزور نہیں بلکہ اپنی معقولیت پسندی، ترقی پذیری اور بہتر انسانی اقدار کی تشکیل و تعمیر کے مرہونِ منت ہیں کہ انبیائے سابقین کی تعلیمات سے ٹکراتے نہیں ہیں بلکہ انسان کو اور آگے لے چلتے ہیں۔ یہ بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ ان اقدامات ہی سے صدیوں بعد یورپ، امریکہ اور ایشیا و افریقہ نے خود اپنے لیے ترقی کی سمت و راہیں متعین کیں۔ لیکن انھوں نے جو انحرافات کیے اس کے نتائج کی ذمہ داری خود اُن پر ہے۔

اس ترقی پسندی کے کچھ ایسے بھی پہلو تھے جنھیں تیرہ سو برس بعد گاندھیائی سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی فلسفے کی شکل دینے کی ہندوستان میں انقلابی کوشش رہی۔ اسی لچک دار ترقی پسندی کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ خود اسلام کے اندر ایسے نظاموں، طرزِ فکر اور طرزِ حکومت کی گنجائش نکالی گئی جن میں اسلامی خصوصیات کو باقی رکھتے ہوئے لبنان، شام، عراق، مصر، ایران وغیرہ جن میں اسلامی ترقی پسندی کے امکانات کے تجربے کیے جا رہے ہیں۔ دیکھیں اس تازہ تگ و دو میں اسلامی ترقی پسندی دنیا کو اور کیا کیا تحفے دیتی ہے۔ اس ہجوم نظریات میں ہم اپنے آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ہم کتاب و سنت کی روشنی میں اپنے حقوق و فرائض کا سائنسی جائزہ لینے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے اخلاقی اور علمی حوصلہ مندی کا ثبوت دے رہے ہیں یا صرف بہتے ہوئے دھارے کے رُخ پر بہے جا رہے ہیں؟

ایران میں امام خمینی کے کارنامے کی سیاسی اہمیت کے بارے میں کچھ کہنا

ضروری نہیں کیونکہ اس پر اربابِ فکر ونظر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ آئندہ بھی اس موضوع پر لکھا جاتا رہے گا۔ یہ موضوع مستقل مطالعے کا طالب ہے۔ اسلامیات کی نظری سطح پر بھی امام خمینی کے کارنامے کی اہمیت ہے۔ مصرو لبنان وشام کے علاوہ سعودی عرب میں بھی جو کام ہورہا ہے اس میں نئی حرکت کے آثار نمایاں ہیں۔ مطالعہ اور تفکّر وتدبّر کی راہیں کھل رہی ہیں اور اسلامی تعلیمات واضح اور سدا بہار ہیں۔ افسوس کے ساتھ یہ قبول کرنا پڑتا ہے کہ بہت سے گوشوں میں آج کا اسلام عہد رسالت کا اسلام نہیں تو کیا ہے۔ کہیں کہیں اس میں ملوکیت کے استحصالی انحرافات درآئے ہیں، کہیں سرمایہ دارانہ اور نوآبادیاتی رجحانات ابھر رہے ہیں، بعض گوشوں میں بے راہ روی کو طرّہ ٔ امتیاز سمجھا جانے لگا ہے۔ اسی کے پہلو بہ پہلو آج کی اسلامی دنیا ایک نئی آزادیِ فکر سے روشناس ہوئی ہے اور اس میں انقلابی توانائی پھر سے درآئی ہے۔ دوسری طرف آنکھیں بند کرکے ماضی کی طرف دوڑنے کی رجعت پسندی بھی نمایاں ہے۔ اس رنگارنگی میں مستقبل کی راہ کیسے متعین کی جائے۔ آج دنیا میں ترقی اور روشنی کے جتنے منابع ہیں، ان میں اسلام اہم منبع ہے اور اس منبع کے عالمی وارثوں کو بیدار مغزی کا ثبوت دینا ہوگا۔

اس منبع کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ آج دنیا کا بہت بڑا حصہ اسلام کے ماننے والوں پر مشتمل ہے، جنھیں براہِ راست مخاطب کیا جاسکتا ہے۔ مسلم معاشرے کے بعض اجزا آج مائل بہ تنزل سہی، لیکن مجموعی طور پر ترقی پسندی سے آشنا معاشرہ ہے اور اس کی تعلیمات میں آزادیِ رائے واظہار اور ان تعلیمات کی بنیادی مساوات اور اجتہاد فکر وعمل کی بڑی گنجائش ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سماجیات اور اقتصادیات، سیاسیات اور سائنسی ایجادات وتجربات کے متوازن احساس کے دوش بدوش روحانی اور اخلاقی پہلو بھی اسلام کے نظام فکر کا حصہ ہیں، لیکن یہ حصہ دوسرے حصوں کا معاون ہے، مخالف یا دشمن نہیں ہے۔

ہم اس کے عادی سے ہوگئے تھے کہ ترقی پسندی اور اشتراکیت کا ذکر لازم وملزوم کی حیثیت سے کیا جائے، لیکن یہ لازم وملزوم نہیں ہے اور ترقی پسندی پر کسی خاص نظامِ فکر کی اجارہ داری نہیں ہے۔ ایک زمانے میں اشتمالیت کو اقتصادی فکر ونظر کا نقطۂ آخر سمجھا جاتا تھا، لیکن اس کے بعض اندرونی تضادات سے ظاہر ہوا کہ یہ بھی ایک درمیانی منزل تھی۔ آج سابق کمیونسٹ ملکوں میں فکری سطح پر بڑی کرب ناکی کے ساتھ ایک انقلابِ عظیم آچکا ہے۔ بہت سے مسلمات مسترد ہوگئے یا مزعومات میں تبدیل ہوچکے ہیں۔ مارکس اور لینن کے مجسمے ڈھادیے گئے ہیں، لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ اس صورتِ حال نے کسی فکری خلا کو جنم دیا ہے۔ اس درہمی اور برہمی کا حل رہنمایانہ اصولوں کی روشنی میں تلاش کیا جارہا ہے۔ اگر اسلام کی تاریخ کچھ رہنمایانہ اصول پیش کرے تو ان پر نگاہیں مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلسل تلاش اور فکر اور اس کے نتیجے میں احکام وافکار اسلامی کی نئی تطبیق کو نئی ترقی پسندی کا محور کیوں نہ بنایا جائے؟ آج کی گھبرائی ہوئی اور پسپائی سے دوچار دنیا ہم سے، آپ سے یہ سوال کررہی ہے۔

ایک خوشگوار تبدیلی ہوئی ہے کہ مغربی ممالک اور آسٹریلیا اور افریقہ میں اسلامی فکر اور اسلامی نظام حیات سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ ہمارے اکثر علما ابھی متکلمانہ بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں یا آپس ہی میں چھوٹے موٹے گروہوں کی عیب شماری، تکفیر سازی میں مشغول ہیں اور اخوت کی جو فلسفیانہ، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی جڑیں ہیں ان کو بھول بیٹھے ہیں۔ یہ صورت اسلامی تعلیمات کی بنیادی فکر سے عدم واقفیت اور جذباتی اور فکری عدم وابستگی کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہ راستے مزید تباہی اور تنزل کی طرف لے جانے والے ہیں۔ ایسے دور میں جب دنیا اسلام کی روح کو پانے کی کوشش کررہی ہو، بنیادی افکار سے ہماری غفلت تعجب خیز ہی نہیں افسوس ناک بھی ہے۔

اگر ہم ذرا بھی غور کریں تو محسوس ہوگا کہ اسلام کا نظام عمل، تدبیر منزل کا نظام

ہے۔ انسانی قوتوں کے استعمال کرنے اور خوابیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کا نظام ہے۔ یہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے والے توکل یا تقدیر پرستی کا نظام نہیں ہے۔ اسلامی توکل اور فلسفۂ تقدیر مثبت اور عملی توکل وتقدیر ہے جو جوع الارض اور حرص وہوس سے باز رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ سستی، کاہلی، گداگری اور بے عملی کا بھی دشمن ہے۔ تقدیر ہمارے حالات کو قوتِ بازو اور قوائے فکری کے ذریعے سے بدلتی ہے۔ اسی کو شاعرانہ طور پر اقبال نے یوں کہا ہے کہ اگر تقدیر بدلنے کا ترقی پسندانہ جذبہ مستحکم ہو تو قدرت خود ہر حکم تقدیر سے پہلے اپنے بے پایاں ذرائع سے بندے سے خود پوچھ لیتی ہے کہ ''بتا تیری رضا کیا ہے؟''

نظام اسلامی کے خاص اکتسابات میں یہ بات تھی کہ اس نے قبل اسلام کے فکری جبر واستبداد اور کورانہ تقلید وتوہم پرستی سے یہ کہہ کر نجات دلائی کہ عقل کی رہبری ہی میں قدم اُٹھانا چاہیے۔ عقل وحکمت کو عطیۂ الٰہی قرار دیا گیا۔ خود کلام پاک میں ارشاد ہوا کہ

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ (البقرۃ:۲۶۹) ''اللہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا ہوئی تو بے شبہ اسے خوبیوں کی بڑی دولت ہاتھ لگی اور عقل مند ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔''

اسی کو سورۂ صٓ میں ایک اور طریقے سے بیان فرمایا گیا ہے:

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ (صٓ:۲۹)

(اے رسولؐ! ہم نے تمھارے پاس جو کتاب نازل کی ہے بڑی برکت والی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور عقل والے نصیحت حاصل کریں۔) اِن اشاراتِ قرآنی کو حدیثِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ میں یوں واضح کرکے بیان کیا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جو چیزیں بانٹی ہیں اُن میں عقل سے افضل کوئی شے نہیں ہے۔ اس لیے عاقل کی نیند بھی جاہل کی بیداری سے بہتر ہے اور عاقل کا گھر میں رہنا جاہل کے سفر

سے بہتر ہے۔'' امام جعفر صادق علیہ السلام نے مزید تشریح کی: ''انسانی شخصیت کا ستون عقل ہوتی ہے اور ذہانت اور فہم، حافظہ اور علم کا سرچشمہ عقل ہی ہے۔ عقل کے ذریعے سے انسان کی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ عقل انسان کی رہبر، اسے بصیرت عطا کرنے والی اور اُس کے امور کی کنجی ہے۔ جب کسی انسان کی عقل کو نورِ ربانی کی تائید مل جاتی ہے تو وہ عالم، حافظ، ذاکر اور صاحبِ فہم وفراست ہو جاتا ہے اور اسے کیسے، کیوں اور کہاں کا علم ہوتا ہے اور اسے یہ معرفت حاصل ہو جاتی ہے کہ اُسے کون نصیحت کر رہا ہے اور کون نتیجہ دے رہا ہے اور وہ یہ اچھی طرح جان جاتا ہے کہ طرزِ زندگی کیا ہونا چاہیے، کس سے مل کر رہنا چاہیے اور کس سے علیحدگی اختیار کرنا چاہیے۔ تب وہ وحدانیتِ الٰہی سے پرخلوص وابستگی اختیار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کا اقرار کرتا ہے۔'' ان معنوں میں اسلام اُس وقت معتقدات اور عبادات ہر معاملے میں عقل کو راہبر بنانے پر زور دیتا ہے۔ ابھی یورپ میں نشاۃ الثانیہ اور اصلاح پسندی کے مسئلے میں عقل کی کارفرمائی پر بحث کو بھی سیکڑوں سال باقی تھے۔

اسلام کا دوسرا اہم فیضان تھا انسان کے اندر احساسِ عظمت وخوداعتمادی پیدا کرنا اور اس کو یہ بشارت دینا کہ اس کی بہبود کے لیے زمین وآسمان کی تسخیر کی گئی ہے۔ اس تسخیرِ ارض وسماوبحور کے ذریعے رزق کی فراہمی میں ہر طبقہ بندی اور تفریق سے اوپر اُٹھ کر اس طرح آسانیاں فراہم کرنا کہ اسلامی طرزِ مساوات قائم ہو سکے۔ مال واموال کی ذخیرہ اندوزی سے منع کیا گیا۔ غلامی کے مستحکم اور جہانگیر ادارے پر یہ کہہ کر بھرپور وار کیا گیا کہ غلاموں سے بھائیوں جیسا سلوک کیا جانا چاہیے۔ غلام کو آزاد کرنا بڑی فضیلت کا عمل قرار دیا گیا اور اس منحوس ادارے کے خاتمے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے۔ آزادیِ نسواں کی راہ میں اس ضعیف صنف کو مردوں کے دوش بدوش ہمکارانہ اور ہمدردانہ حقوق تفویض کیے گئے۔ قبائلی، نسلی اور جغرافیائی تفریقوں کو احساسِ اخوت ومساوات

سے بدل دیا گیا۔ پھر روزمرہ کی زندگی میں معاشرے کی بہبودی اور حکمرانی کے زرّیں
اصول فراہم کیے گئے۔ ان اصلاحات و اقدامات کا مختصر ذکر آپ آنے والے صفحات
میں دیکھیں گے۔ یہ صرف ایک جھلک ہے، لیکن اس جھلک سے بھی آپ کو اس کی
تفصیلات اور اس کی وسعت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ امید ہے کہ وہ صاحبانِ علم جن کی
نظر نسبتہً کسی بڑے کینوس پر مرکوز رہتی ہے اور جن کا مطالعہ بھی وسیع تر ہے، وہ اس
موضوع کے ساتھ پورا انصاف کریں گے۔ اس کتاب کا آغاز اب سے کچھ برس پہلے
ایران اور وسط ایشیا کے چار سالہ قیام کے دوران ہوا تھا۔ ایران میں یہ لڑکھڑاتی ہوئی
شہنشاہیت کا دور تھا اور قدغن عام تھی۔ پبلک کتب خانوں، حد یہ ہے کہ یونیورسٹی کے
کتب خانوں تک رسائی مشکل تھی۔ بعض احباب بالخصوص برادرِ عزیز مولانا سید علی محمد
نقوی صاحب مجتہد، جو اس زمانے میں وہاں بسلسلہ تعلیم مقیم تھے، کئی کتابوں کی فراہمی
میں معاون ہوئے۔ ان سب کا شکریہ ادا کرنا میں فرض سمجھتا ہوں۔

خدا کرے یہ مختصر سی کتاب نئی نسل کو نئے خطوط پر مزید غور و فکر کی دعوت دے
اور اس ترقی پسند پیغام کو عام کرنے کے لیے خود اپنی ذات کو نمونہ عمل بنا لے۔

بمبئی ۱۹۹۵ء　　علی جواد زیدی

قبل اسلام کے عمومی حالات

اسلام کی تعبیر جدید کا کام بظاہر جتنا سہل نظر آتا ہے اُتنا ہی مشکل بھی ہے اور
گہرا مطالعہ چاہتا ہے۔ اس کے لیے دنیا کی تاریخ، مذاہب کی تاریخ، سیاسی، اقتصادی
اور فلسفیانہ عقاید کی تاریخ اور خود اسلام کی تاریخ کا تفصیلی جائزہ لیے بغیر اسلامی تعلیمات
کے ترقی پسندانہ کردار کو نمایاں نہیں کیا جاسکتا۔ اس مختصر سے کتابچے میں صرف اتنا کہا
جاسکتا ہے کہ جب اسلامی پیغام سنایا گیا تو دنیا کے مختلف حصوں میں کئی مذاہب پھیل چکے
تھے۔ خود عرب میں بت پرستوں کے علاوہ عیسائیوں اور یہودیوں کی خاصی تعداد موجود
تھی۔ ایران میں زرتشت، چین میں کنفیوشس کے اور مشرق بعید و قریب میں بدھ مت
کے ماننے والے پائے جاتے تھے۔ ہندوستان میں ہندومت کے مختلف روپ اس پر
مستزاد تھے۔ ہر بڑے مذہب کا ایک نظام اخلاق اور فکری سرمایہ تھا۔ ایک ہلکا سا فلسفہ بھی
تھا جس کی جڑیں یونان و ہندوستان و ایران میں قبل مسیح تک جاتی تھیں۔ تہذیبوں میں

نیل و بابل و یونان پھر ایران کی تہذیبیں پہلے سے وجود میں آ چکی تھیں۔قبیلوں پر اُن کے
سرداروں اور چھوٹے بڑے ملکوں پر راجاؤں اور بادشاہوں کی حکومتیں تھیں، جن کی بنیاد
مطلق العنانی پر تھی۔عوام بے بس اور مجبور تھے۔بادشاہ سے لے کر معمولی حکام تک انھیں
ستاتے تھے اور اس کی داد فریاد نہیں تھی۔سماج قبیلوں اور طبقوں میں بٹا ہوا تھا اور قبائلی و
علاقائی جنگیں ہوتی ہی رہتی تھیں۔کچھ طبقے مال و دولت کی بنا پر یا پیدائش کے اعتبار سے
اعلیٰ بن گئے تھے۔بیشتر طبقے محکومی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔غلامی کا رواج عام تھا اور
غلاموں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔عورت گھر کے اندر لونڈیوں کی طرح محصور اور ہر طرح
کے حقوق سے محروم تھی۔بعض مذاہب نے اخلاقیات کے کچھ موٹے موٹے اصول ضرور
بنالیے تھے، لیکن ایک تو ان پر بھی رفتہ رفتہ طبقہ واری تصورات کی چھاپ لگ گئی،
دوسرے حکمراں طبقوں پر ان اخلاقی قوانین کی پابندی لازمی نہیں رہ گئی تھی۔امیر و غریب
کا فرق بہت واضح تھا۔امیر اور زیادہ امیر ہوتے جا رہے تھے اور غریب، غریب تر۔تاجر
اور سود کا کاروبار کرنے والے اپنے کو ہر اصول سے بلند تر سمجھتے تھے۔مذہبی رہنماؤں میں
بھی اخلاقی کج رفتاری آ گئی تھی۔بادشاہ اور مذہبی رہنما دونوں اس پر خوش تھے کہ عام
انسان بہت سے خداؤں کی پرستش کرتے رہیں بلکہ کسی نہ کسی شکل میں وہ خود اپنی پوجا
کے بھی متمنی تھے۔قتل و غارت و فساد کے لیے بس ذرا سے بہانے کی ضرورت ہوتی۔ایسی
صورت میں امن و سکون میں استواری کہاں؟ علم کے صرف چند ٹھیکہ دار تھے۔بعض
ملکوں میں تو صرف چند ذاتوں کو ہی علم حاصل کرنے کا حق حاصل تھا۔انسان انسان کا
غلام تھا۔کہیں جسمانی طور سے اور کہیں ذہنی طور سے۔اہلِ کتاب نے یا تو کتابیں تہہ
کر کے طاقوں پر سجادی تھیں یا ان میں تحریفیں کر ڈالی تھیں اور اصل سے منحرف ہو گئے
تھے۔غور تو کیجیے کہ ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں کتنی بھیانک اور گھنگھور تاریکی چھائی
ہوئی تھی۔انسان اس تاریکی میں چاروں طرف سے لپٹ گیا تھا۔

ان عمومی حالات میں عرب سے انقلاب کی ایک زبردست لہر اٹھی۔ماضی بعید
میں حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور مہاتما گوتم بدھ (بقولے حضرت ذوالکفل) کی آواز
اُٹھ کر دب چکی تھی اور فضا ایک نئی کروٹ بدلنے کے لیے بالکل آمادہ تھی۔یہ چودہ سو برس
پہلے کی بات ہے۔اس زمانے کی یہ عرب دنیا مؤرخوں اور مناظروں کی توجہات کا مرکز
بنی ہوئی ہے اور بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور یقیناً آگے بھی لکھا جاتا رہے گا۔یہاں ہم
ربط بیان کے لیے مختصر ترین لفظوں میں اعراب جاہلی کے بارے میں چند باتیں بیان
کریں گے۔

اعراب جاہلی کی اکثریت صحرانشیں خانہ بدوش تھی۔اونٹ اور خیمہ ان کی
زندگی کا محور تھا۔خیموں میں زندگیاں بسر کرتے تھے تاکہ قحط یا جنگ وغیرہ کی وجہ سے اگر
نقل مکانی کرنا پڑے تو آسانی سے خیموں کو بھی دوسرے مختصر اثاثے کے ساتھ بار کر کے
ساتھ لے جا سکیں۔ریگستانی زندگی بے آب و گیاہ تھی۔پانی کی شدید قلت کی وجہ سے
زراعت اور باغبانی کی طرف توجہ کم تھی۔کھجور کے باغ، نخلستانی پانی کے وجود پر منحصر تھے،
جہاں پانی ہوتا وہ آبیاری کرتے رہے۔زراعت سے عدم وابستگی پانی کے وسیلوں کی کمی
کی وجہ سے تو تھی ہی، لیکن اس کا سبب ان کی خانہ بدوشی اور جہالت بھی تھی۔زراعت تو
انسان کے پانو تھام لیتی ہے اور مہاجرت میں بھی مانع ہوتی ہے۔کچھ چھوٹی چھوٹی
آبادیاں بھی تھیں، جیسے ہمارے ہندوستان کے بڑے گانو اور چھوٹے قصبات۔ایسے
قصبوں اور شہروں میں کچی اینٹوں کے چند مکانات بھی ہوتے تھے۔لین دین اشیا کے
باہمی تبادلے کے ذریعے ہوتا تھا کیوں کہ اس میں حساب کا جھنجھٹ کم تھا، محنت کم لگتی تھی
اور فائدہ جلد بلکہ فوری مل جاتا تھا۔روپے جس طرح بھی ملتے ٹھیک تھا۔تجارت میں
لوٹ مار، قتل و جنگ، بردہ فروشی، ناپ تول میں بے ایمانی، فحاشی کسی سے عار نہیں تھا،
بلکہ جس قبیلے کے پاس لوٹ مار کا مال زیادہ ہوتا وہ زیادہ معزز سمجھا جاتا۔عبداللہ بن

جدعان تمیمی اور عبداللہ بن ابی نے انھیں طریقوں سے دولت فراواں حاصل کی تھی۔[1]
قمار بازی بھی دولت بڑھانے کا ایک وسیلہ تھی۔ استیاز بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔[2]
سود خوری عام تھی۔ سود در سود کبھی سو فی صد بھی ہوتا تھا اور نتیجے میں قرض لینے والے کی کل
جائداد ہی نہیں بلکہ دختر بھی چلی جاتی تھی۔ تول ناپ میں کمی بیشی عام تھی۔ تاجر دو ترازو
رکھتے ایک بیچنے کے لیے اور دوسری خریدنے کے لیے۔ اس طرح بے زحمت دولت پیدا
کرنے پر زور تھا جس کی اسلام نے مخالفت کی اور ذرائع پیداوار کے فروغ پر زور دیا۔
ایک نئے اقتصادی اخلاق کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی۔ معمولی معمولی باتوں پر خوں ریزی
ہو جاتی تھی۔ گبن نے قبل اسلام جنگوں کی تعداد سترہ سو بتائی ہے۔ انمیں سے کچھ جنگیں تو
سو سال تک جاری رہیں۔ ثار اور قصاص کا رواج اس پر مستزاد تھا۔ ان باتوں کو پیش نظر
رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ استعماری پروپیگنڈے نے قبل اسلام کے رواجوں اور
سزاؤں کو بھی اسلام سے وابستہ کر دیا ہے۔ حضرت علی نے تفصیلات سے ہٹ کر اجمالی
اور احصائی طور پر قبل اسلام کی زندگی کا مرقع کھینچ دیا ہے۔ "نہج البلاغہ" کے اقتباسات
سے اس پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ معاصر شہادت ہے اور اُس
ہستی نے بیان کی ہے جو سنی سنائی باتیں نہیں کہتا بلکہ جو عینی اور باخبر شاہد ہے:

۱) وَ اَهلُ الاَرضِ يَومَئِذٍ مِلَلٌ مُتَفَرِّقَةٌ وَ اَهوَاءٌ مُنتَشِرَةٌ وَ طَرَائِقُ مُتَشَتِّتَةٌ بَينَ مُشَبِّهٍ لِلّٰهِ بِخَلقِهِ اَو مُلحِدٍ فِي اِسمِهِ اَو مُشِيرٍ اِلىٰ غَيرِهِ فَهَدَاهُم بِهِ مِنَ الضَّلَالَةِ وَ اَنقَذَهُم بِمَكَانِهِ مِنَ الجَهَالَةِ.

---

۱ جاہلیت و اسلام: علامہ یحیٰ نوری: ۶۹۱ (طبع ششم)

۲ اگر کسی بیاباں میں غیر قبیلہ کا کوئی فرد یا جماعت ملتی اور بے اسلحہ ہوتی یا اس پر غلبہ پانا ممکن آتا تو کہتے کہ ایسا ہے قید میں آجاؤ۔ وہ اقرار کر لیتا یا مر کر جان دے دیتا۔ زندہ رہتا تو مملوک ہوتا اور بیچ ڈالا جاتا۔

اس وقت زمین پر بسنے والوں کے مسلک جدا جدا، خواہشیں متفرق و پراگندہ اور راہیں
الگ الگ تھیں، یوں کہ کچھ اللہ کو مخلوق سے تشبیہ دیتے، کچھ اُس کے ناموں کو بگاڑتے،
کچھ اُسے چھوڑ کر اوروں کی طرف اشارہ کرتے۔ اللہ نے (رسول کے ذریعے) اس
گمراہی سے ہدایت کی راہ پر لگایا اور (رسول کے وجود کی بدولت) انھیں جہالت سے
چھڑایا۔ (نہج البلاغہ: خطبہ:۱:ص۷۶)

۲) وَ النَّاسُ فِي فِتَنٍ انجَذَمَ فِيهَا حَبلُ الدِّينِ وَ تَزَعزَعَت سَوَارِي اليَقِينِ وَاختَلَفَ النَّجرُ و تَشَتَّتَ الاَمرُ وَ ضَاقَ المَخرَجُ وَعَمِيَ المَصدَرُ فَالهُدَىٰ خَامِلٌ وَ العَمِيٰ شَامِلٌ عُصِيَ الرَّحمٰنُ وَنُصِرَ الشَّيطَانُ وَ خُذِلَ الاِيمَانُ فَانهَارَت دَعَائِمُهُ وَتَنَكَّرَت مَعَالِمُهُ وَ دَرَسَت سُبُلُهُ وَ عَفَت شُرُكُهُ اَطَاعُوا الشَّيطَانَ فَسَلَكُوا مَسَالِكَهُ وَ وَرَدُوا مَنَاهِلَهُ بِهِم سَارَت اَعلَامُهُ وَ قَامَ لِوَاؤُهُ فِي فِتَنٍ دَاسَتهُم بِاَخفَافِهَا وَ وَطِئَتهُم بِاَظلَافِهَا وَقَامَت عَلىٰ سَنَابِكِهَا فَهُم فِيهَا تَائِهُونَ حَائِرُونَ جَاهِلُونَ مَفتُونُونَ فِي خَيرِ دَارٍ وَ شَرِّ جِيرَانٍ نَومُهُم سُهُودٌ وَكُحلُهُم دُمُوعٌ بِاَرضٍ عَالِمُهَا مُلجَمٌ وَ جَاهِلُهَا مُكرَمٌ.

لوگ ایسے فتنوں میں مبتلا تھے جہاں دین کے بندھن ٹوٹ گئے تھے، یقین کے ستون ہل
رہے تھے، دینی کام درہم برہم اور امر دین پراگندہ تھے۔ نکلنے کی راہیں تنگ و تار تھیں۔
ہدایت گم نام تھی اور ضلالت ہمہ گیر۔ کھلے بندوں اللہ کی مخالفت ہوتی تھی اور شیطان کو مدد
دی جا رہی تھی۔ ایمان بے سہارا تھا۔ اس کے ستون گر گئے تھے اُس کے نشان تک
پہچانے نہ جاتے تھے۔ اُس کے راستے مٹ گئے تھے شاہراہیں اُجڑ گئی تھیں۔ وہ شیطان
کے پیچھے لگ کر اُس کی راہوں پر چلنے لگے تھے اور اُسی کے گھاٹ پر اُترنے لگے تھے
انھیں کی وجہ سے اس کے جھنڈے بلند کرتے اور فتنوں میں بلند ہو رہے تھے۔ شیطان ان

فتنوں کے سموں سے انسانوں کو روندتا اور کھروں سے کچلتا رہا۔ یہ فتنے مضبوطی سے پنجوں کے بل کھڑے رہے۔ لوگ پریشان، حیران، سرگرداں، جاہل اور فریب خوردہ تھے۔ یہ بہترین گھر (خانہ کعبہ) میں بدترین ہم سایوں (اہل مکہ) سے دوچار تھے۔ وہاں نیند کی جگہ بے خوابی، سرمے کی جگہ آنسو تھے۔ وہ ایسی سرزمین تھی کہ دانائی نے منہ میں خموشی کی لگام لگائی تھی اور جاہل معزز و سرفراز تھا۔ (نہج البلاغہ: خطبہ:۲)

۳) وَ اَنْتُم مَعْشَرَ الْعَرَبِ عَلىٰ شَرِّ دِيْنٍ وَ فِي شَرِّ دَارٍ مُنِيخُونَ بَيْنَ حِجَارَةٍ خُشْنٍ وَ حَيَّاتٍ صُمٍّ تَشْرَبُونَ الْكَدِرَ وَ تَاْكُلُونَ الْجَشِبَ وَ تَسْفِكُونَ دِمَائَكُمْ وَ تَقْطَعُونَ اَرْحَامَكُم ، اَلْاَصْنَامُ فِيكُم مَنْصُوبَةٌ وَالْاٰثَامُ بِكُم مَعْصُوبه۔

اے گروہ عرب اُس وقت تم بدترین دین پر اور بدترین گھروں میں تھے، کھردرے پتھروں اور زہریلے سانپوں کے درمیان تم بودوباش رکھتے تھے۔ تمھارا مشروب گدلا اور گندا پانی اور تمھارا کھانا تھا جشب (ایک قسم کا معجون جو خرمے کی گٹھلی، خون، اونٹ کی مینگنی اور سُکھائے ہوئے گھڑیال سے تیار ہوتا تھا)۔ تم خوں ریزیاں کرتے تھے اور اپنے ہی خویش و اقارب کو مار ڈالتے تھے۔ بُت تمھارے اندر گڑے ہوئے تھے اور گناہ سے تم چمٹے ہوئے تھے۔ (نہج البلاغہ: خطبہ:۲۶)

۴) اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا (ﷺ) وَ لَيْسَ اَحَدٌ مِنَ الْعَرَبِ يَقْرَاءُ كِتَاباً وَلَايَدَّعِي نُبُوَّةً فَسَاقَ النَّاسَ حَتّىٰ بَوَّاهُم مَحَلَّتَهُم وَ بَلَّغَهُم مَنْجَاتَهُم فَاسْتَقَامَتْ قَنَاتُهُم وَ اطْمَئَنَّتْ صَفَاتُهُم اَمَا وَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُ لَفِي سَاقَتِهَا حَتّىٰ تَوَلَّتْ بِحَذَافِيرِهَا مَا ضَعُفْتُ وَ لَا جَبُنْتُ۔

اللہ سُبحانہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کو پیغمبری پر مشرف کیا تو عرب میں کوئی کتاب کو پڑھنے والا نہ تھا اور نہ کوئی ہمسری کا دعویدار تھا۔ پس آپ نے لوگوں کو ان کی اصلی جگہ کی طرف رہنمائی کی اور آخر کار انھیں نجات کی منزل تک پہنچایا۔ اُن کے غم دور ہوئے اور اُن کے حالات (نئے نظام سے) مستحکم اور استوار ہوئے۔ اُن کے لرزتے پتھروں (دلوں نے) تھرتھرانا چھوڑ دیا۔ بخدا، اُس زمانے میں مَیں اُن لوگوں میں تھا کہ جو دشمنوں کے لشکروں کو بھگا رہے تھے، یہاں تک کہ یہ دشمن گھونگھٹ کھا گئے۔ اس کام میں مَیں نے نہ کمزوری دکھائی اور نہ بزدلی سے کام لیا۔ (نہج البلاغہ: خطبہ:۳۳)

۵) اَرْسَلَهُ عَلىٰ حِيْنِ فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ وَطُولِ هَجْعَةٍ مِنَ الْاُمَمِ وَ اِعْتِزَامٍ مِنَ الْفِتَنِ وَ اَنْتِشَارٍ مِنَ الْاُمُورِ وَ تَلَظٍّ مِنَ الْحُرُوبِ وَالدُّنْيَا كَاسِفَةُ النُّورِ ظَاهِرَةُ الْغُرُورِ عَلىٰ حِينِ اصفِرَارٍ مِن وَرَقِهَا وَ اِيَاسٍ مِنْ ثَمَرِهَاوَ اِغْوِرَارٍ مِنْ مَائِهَا قَدْدَرَسَتْ مِنَارُ الْهُدىٰ وَ ظَهَرَتْ اَعْلَامُ الرَّدىٰ فَهِيَ مُتَجَهِّمَةٌ لِاَهْلِهَا عَابِسَةٌ فِي وَجهِ طَالِبِهَا ثَمَرُهَا الْفِتْنَةُ وَ طَعَامُهَاالْجِيفَةِ وَ شِعَارُهَا الْخَوفُ وَ دِثَارُهَا السَّيفُ، فَاعْتَبِرُوا عِبَادَاللّٰهِ وَاذْكُرُوتِيكَ الَّتِي اٰبَاوْئُكُم وَ اِخْوَانُكُم بِهَا مُرتَهِنُونَ وَ عَلَيْهَا مُحَاسِبُونَ۔

اللہ نے (رسول کو) اس وقت بھیجا جب کہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ رُک چکا تھا اور ساری اُمتیں مدتِ مدید سے پڑی سو رہی تھیں۔ فتنے سر اُٹھا رہے تھے۔ سب چیزوں کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ دنیا بے رونق و نور تھی اور اُس کی فریب کاریاں کھلی ہوئی تھیں، اس وقت اُس کے پتے پیلے پڑ چکے تھے اور اُس کے پھل لانے سے مایوسی ہو چکی تھی (علوم و معارف کے سرچشمے کا) پانی تہ نشین ہو چکا تھا اور ہدایت کے مینار نابود ہو چکے تھے۔ ہلاکت و گمراہی کے پرچم کھلے تھے اور یہ سب تیوریاں چڑھائے

اپنے طالب کے چہروں کو تیکھی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے لیے فتنہ پھل تھا اور مردار غذا۔ اندر کا لباس خوف اور باہر کا پہناوا تلوار تھی۔ پس اے اللہ کے بندو! عبرت حاصل کرو اور ان (بداعمالیوں) کو یاد کرو جن کا بھگتان آج تمھارے باپ بھائی بھگت رہے ہیں اور جن کا ان سے محاسبہ ہونے والا ہے۔ (نہج البلاغہ: خطبہ:۸۷)

۶) بَعَثَهٗ وَالنَّاسُ ضُلَّالٌ فِی حَیْرَۃٍ وَ حَابِطُونَ فِی فِتْنَۃٍ قَدِاسْتَهْوَتْهُمُ الْاَهْوَاءُ وَاسْتَزَلَّتْهُمُ الْكِبْرِيَاءُ وَاسْتَخَفَّتْهُمُ الْجَاهِلِيَّةُ الْجُهْلَاءُ حَيَارىٰ فِی زِلْزَالٍ مِنَ الْاَمْرِ ، وَبَلَاءٍ مِّنَ الْجهْلِ فَبَالَغَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ وَ سَلَّمَ فِی النَّصِيحَةِ وَ مَضیٰ عَلَی الطَّرِيقَةِ وَ دَعَا اِلَی الْحِكْمَةِ وَ الْمَوعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔
پیغمبر کو اس وقت میں بھیجا، جب لوگ حیرت کے عالم میں راہ بھول چکے تھے اور فتنوں میں ہاتھ پیر مار رہے تھے، نفسانی خواہشوں نے انھیں بھٹکا دیا تھا اور بھرپور جاہلیت نے ان کی عقلیں کھو دی تھیں اور حالات کے ڈانو ڈول ہونے اور جہالت کی بلاؤں کی وجہ سے حیران تھے۔ چنانچہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ نے پیغام پہنچانے اور سمجھانے بجھانے کا حق ادا کیا اور خود سیدھی راہ پر قائم رہے اور لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحتوں کی طرف بلاتے رہے۔ (نہج البلاغہ: خطبہ:۹۳)

ایک اور خطبے میں حضرت علی نے ارشاد کیا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کی بدولت دبی ہوئی اور نادار، مفتوحوں اور مظلوموں اور زیردست بنائی گئی اور کچلی ہوئی قومیں اعتماد سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اُن کی تعلیمات نے مغرور، سرکش، طماع اور وحشیانہ خواہشات اور فاتح ظالموں کے ظلم و استبداد پر روک لگائی۔ اُن کے خطبات سے لوگوں نے سچائی کی روح کو دریافت کیا اور اُن کی خاموشی سے نیکی اور دین کا ظہور ہوا۔ یہ صورتِ حالات کا صحیح نقشہ ہے کیوں کہ اُس وقت لوگ کسی بھی سچے مذہب کی پیروی نہیں

کر رہے تھے۔ سچائی اور انصاف جیسے عام اخلاقی اصول پر بھی کسی کا اعتقاد نہیں رہ گیا تھا۔ زندگی کی بنیادی قدریں تتر بتر ہو رہی تھیں۔ ایک اخلاقی بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ اس کی اصلاح کا بیڑا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ نے اُٹھایا اور شدائد جھیل کر کامیابی کی راہیں نکالیں۔

بہت سے چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹا ہوا عرب سماج، طبقات میں بھی منقسم تھا۔ طبقات کی تقسیم بدویانہ معاشی نظام میں بہت زیادہ واضح نہیں ہوتی۔ پھر بھی اونچ نیچ کا فرق تھا، قبائلی تاریخ سے وابستہ افتخار کا فرق تھا۔ انسانی حقوق کا کوئی تصور نہیں تھا، طاقت اور زور زبردستی یا جعل و فریب سے جو بھی حاصل ہوتا وہی حق تھا اور یہ قبائلی نظام میں تسلیم کرلیا گیا تھا۔ مذاہبِ عامہ بُت پرستی اور توہم پرستی پر مبنی تھے اور انسانوں کو ملانے کی بجائے اُن کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹتے ہوئے تھے۔ نسلی اور وطنی امتیازات بھی تھے، لسانی تعصب بھی تھا۔ اِن حالات کو سدھارنے کے لیے اسلام نے جو کوششیں کی اور رسول اللہ کی رہبری میں جو مسلسل جہاد کیا گیا وہ نیکی اور خیر کے اُن متفرق کاموں سے مختلف تھے جو کم تر لوگ بھی کرتے چلے آئے تھے۔ اسلامی پیغام کا مقصد پورے معاشرے کی روح کو بدلنا اور ایک نئے نظام کو جاری کرنے کے لیے فضا ہموار کرنا تھا۔ یہ پیغام اس طرح نہیں جاری ہوا کہ کوئی پیغام سنادے اور لوگ سنتے ہی ایمان لے آئیں اور تصدیق کرنے لگیں۔ ایک ایک بات کو، پیغام کے معمولی سے پہلو کو منوانے کے لیے بھی بڑے جتن کرنے پڑے ہیں۔ بحث و گفتگو ہوئی ہے، ردّ و بدل ہوا ہے، تکلیفیں اور اذیتیں جھیلنا پڑی ہیں، قربانیاں دی گئی ہیں۔ بڑی مشکل سے اور آہستہ آہستہ بات مانی گئی ہے۔ اطوار و عادات، تصورات بدلے ہیں۔ اس پس منظر میں دیکھیے تو اسلام ایک عظیم انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسا انقلاب جو روحانی اور اعتقادی بھی تھا اور مادّی و اقتصادی بھی۔ اسلام نہ صرف دنیا ہے، نہ صرف آخرت، نہ کوری رہبانی روحانیت ہے، نہ سراپا مادّیت۔ یہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایسا امتزاج

ہے جس کو ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں دیکھ کر مؤرخین و مفکرین آج بھی محوِ حیرت رہ جاتے ہیں۔ اس کو کوری فلسفہ آرائی سے دور کا واسطہ نہیں، اسلامی فلسفہ ایک عملی حقیقت ہے۔ یہ ایسا فلسفہ ہے جس میں خیال کا ہر موڑ عمل کی اچوک کسوٹی پر کسا گیا ہے۔ اسلام فکر و عمل میں مکمل اتحاد کا ایک مثالی کارنامہ تھا، جس میں تاریخی ارتقا کے جوہر پوشیدہ تھے۔

اسلامی نظام کی اساس

اسلامی نظام کی اساس اس کا تصورِ اِلٰہ اور توحید ہے۔ اب سے کوئی چودہ سو برس پہلے ایک کرب انگیز ماحول میں، عرب کے سائیں سائیں کرتے ہوئے ریگستانوں سے ایک پُر متانت آواز اُبھری۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ (اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں) اور یہ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اَللّٰہُ اَکْبَر ! یہ آواز بے آب و گیاہ ریگ زار میں آندھی کی سرعت سے پھیل گئی۔ اس کی گونج نے دلوں کو دہلا دیا۔ مخالفتوں کے طوفان اُمڈ پڑے، فتنے اُٹھنے لگے۔ ارادہ کیا گیا کہ یہ آواز بے دردی سے دبا دی جائے، لیکن جو بھی آواز اٹھی اس نے اس آواز کو کچھ تیز تر ہی کر دیا۔ آخر، ایک اللّٰہُ اکبر کہنے پر لوگ اتنے برہم کیوں ہونے لگے تھے؟

اس سے دوسرے خداؤں کی نفی ہوتی تھی، ان خداؤں اور بُتوں کی نفی ہوتی تھی جن کا سہارا لے کر ان کے ماننے والے سماج میں ناانصافی، ظلم، جہالت اور عدم مساوات کا جال پھیلائے ہوئے تھے۔ یہ ان کے ظلم و جہل کے خلاف نعرۂ جنگ تھا۔ اللہ کی برتری کے چھوٹے سے نعرے میں ایک بڑا انقلابی پیغام پنہاں تھا۔ اگر اللہ ہی سب سے بڑا ہے تو پھر یہ شیوخِ قبیلہ، یہ بادشاہ، یہ حاکم، یہ کاہن، یہ راہب، یہ اسقفِ اعظم، یہ عبادت گاہوں کے برمکھ (برمک)، یہ آتش کدوں کے محافظ، یہ یہودی عبادت کدوں کے مجاور، یہ بڑے

بڑے تاجر، یہ وزیر و کمان دار کیسے بڑے ہو سکتے ہیں؟ یہ آواز ان سب کے لیے جو کسی نہ کسی شکل میں سماج پر حکومت کرتے چلے آ رہے تھے، خطرے کی آواز تھی۔ ظلم و استحصال کے خلاف نعرۂ جنگ تھا۔ پرانے نابرابر نظام کو مٹا کے عدل و انصاف اور انسانی عظمت پر مبنی ایک نظام کے قیام کا اعلان تھا۔ ایک فرسودہ اور استحصالی نظام جا رہا تھا، ایک رجعت پسندانہ صورت حال ختم ہو رہی تھی اور اس کی جگہ ایک ترقی پسند نظام اُبھر رہا تھا۔

یہ ترقی پسندی رسمی مذہب اور گھسے پٹے ریت رواج سے آنکھیں موڑ کے بہت سی صورتوں میں اس کی زوردار مخالفت کر کے، اجتماعی زندگی کی روح سنوارنے کی کوشش میں تھی، انتشار و فساد کو دور کر کے، اتحاد و صلح و امن کی دعوت دیتی تھی تا کہ عام ترقی پسندانہ اقدامات کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔ قریش کے سردار اور اربابِ اقتدار اس آنے والے خطرے کو دور سے بھانپ رہے تھے، جن لوگوں کے مفاد اس پرانے نظام سے وابستہ تھے انھیں مضطرب اور برہم ہونا ہی چاہیے تھا۔

لیکن کیا قریش صرف اس لیے ناخوش تھے کہ ان کے بہت سے خداؤں سے انکار کر کے صرف ایک خدا کا اقرار کیا جا رہا تھا؟ یہ بھی ایک سبب ضرور تھا لیکن قریش دنیا دار لوگ تھے۔ وہ یہ ڈر رہے تھے کہ اس طرح کہیں سیکڑوں بتوں والے شہر مکہ کی مرکزیت ختم نہ ہو جائے اور اس بین الاقوامی تجارتی رہ گزار کو جو اہمیت حاصل ہے باقی نہ رہے۔ کعبہ میں ہر مذہب، ہر قبیلے اور ہر قوم کے بت نصب تھے یا تصویریں موجود تھیں۔ ان چار مہینوں میں جن میں کعبہ کے ارد گرد قتل و خون حرام تھا، بہت سے لوگ یہاں آتے، قیام و تجارت کرتے، عبادت کرتے اور پھر سامان تجارت لے کر آگے بڑھ جاتے۔ ان لوگوں نے یہ بات ٹھیک طور سے محسوس نہیں کی تھی کہ مکہ کی مرکزیت بنیادی طور پر یورپ اور ایشیا کو ملانے والی تجارتی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے ہے اور بت پرستی کے خاتمے کے بعد بھی اس مرکزیت پر اثر پڑنے والا نہیں تھا۔ پھر جن ملکوں سے قافلے آتے

تھے، ان میں عیسائی اور موسوی بھی تھے جو بت پرستی کے خلاف تھے۔ خود عرب میں دینِ براہیمی کے پیروؤں میں وحدت کے قائل افراد موجود تھے۔ اگر یہ بات انھوں نے ٹھیک سے سمجھ لی ہوتی تو شاید وہ اپنی مخالفت میں اتنے شدید نہ ہوتے، لیکن انھیں یہ بھی ڈر تھا محمدی مشن کی کامیابی کے بعد قیادت کا ڈھانچہ بھی شاید بدل جائے اور نئے ڈھانچے میں پرانی قیادت کی جگہ نہ نکلے گی۔ ورنہ مذہب سے اُن کی دلچسپی بہت چھچھلی تھی۔ اس دور کے عام عربوں کی طرح قریش بھی مذہب کے ظاہری رسوم پر بڑا زور دیتے تھے۔ بنیادی اقدار اور مذہب و اخلاق کے اعلیٰ اصولوں سے کم سروکار رکھتے تھے۔ ان کے قبائلی اخلاق کے مذموم گوشوں اور ظاہری رسوم پر نئے دین کی کاری ضرب لگ رہی تھی۔ وہ ماں باپ کے پسندیدہ قبائلی رسوم و اخلاق کو ترک کر لینے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ توہم پرستی کی بنا پر وہ خائف تھے کہ ان رسوم کو ترک کرنے سے وہ کسی نادیدہ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس کے علاوہ قبائلی دوستی اور دشمنی کی بھی ایک تاریخ تھی۔ اسلامی تحریک اتحاد کی بدولت وہ بھی خطرے میں پڑتی نظر آ رہی تھی۔ پھر اسلام امیر و غریب، آزاد و غلام، کالے اور گورے، سب سے یکساں سلوک کا پیغام لایا تھا۔ اس سے تو ان کے تصورات کی معاشی جنت ہی تباہ ہونے والی تھی۔ نئی آواز اُن سب کے لیے جو کسی نہ کسی طرح سماج پر حکومت کرتے چلے آ رہے تھے اور دوسروں کی محنت کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہے تھے، موت کا پیغام معلوم ہو رہی تھی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ توحید کے ساتھ ساتھ یہ منوانے پر مصر تھے کہ صرف اللہ کی عبادت کی جائے اور صرف اسی سے مدد مانگی جائے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ہ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور بس تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں)

زیادہ تر لوگ ایسے تھے جو خدائی طاقت کو بہت سے نقطوں میں بانٹ کر کچھ خود بھی جھپٹ لینا چاہتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو وجودِ الٰہی کے منکر تھے اور کسی نظام اخلاق کے پابند نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ان انکار کرنے والوں اور خدائی میں کسی اور کو

شریک کرنے والوں (مشرکوں) دونوں ہی کو دوٹوک طور سے بتا دیا گیا کہ وہ ہے اور بے شریک ہے اور سب سے بڑا ہے، بس اسی کی عبادت ہوگی، انسان کسی اور کا بندہ نہیں ہوگا، کسی اور کے آگے سر نہیں جھکائے گا۔ یہ انسانی آزادی کا منشور تھا اور قریش نے دوررس خطرات کو محسوس کرتے ہوئے روزِ اول ہی سے اس پیغام کی مخالفت شروع کر دی تھی۔

انسانی عظمت

اگر اللہ ہی سب سے بڑا ہے اور اُسی کا حکم چلے گا، اگر اُس کے سوا انسان کو کسی کے آگے سر نہیں جھکانا ہے تو اِس انسان کو آزادی ہی کا نہیں عظمت کا بھی حامل ہونا چاہیے، زمین و آسمان کو اس کے لیے تسخیر ہونا چاہیے۔ اسلام نے کبھی انسان کو ذلیل اور ہیچ و پوچ نہیں کہا اور نہ جس دنیا میں انسان بستے ہیں اُسے مایا جال قرار دیا، اسلامی نقطۂ نظر سے یہ دنیا حقیقت تھی۔ یہ اصلی اور واقعی تھی اور اسی میں انسان کی معیشت کا سامان مہیا کیا گیا تھا اور انسان کی مادی زندگی کی تکمیل کے لیے بر و بحر کو تسخیر کیا گیا تھا۔ فرشتوں کو بھی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ یہ انسان اُن سے بھی بہتر ہے۔ انسانی برتری اور عظمت کا قرآن کریم میں بار بار اظہار کیا گیا ہے:

۱) وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ وَ حَمَلۡنٰہُمۡ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ وَ رَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلۡنٰہُمۡ عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِیۡلًا ہ (بنی اسرائیل: ۷۰)

[اور ہم نے بنی آدم یعنی انسانوں کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ان کے حمل و نقل کا سامان فراہم کیا اور انھیں پاک اور طیب رزق دیا اور اپنی مخلوقات میں سے اکثر پر انھیں نمایاں فضیلت اور فوقیت دی۔]

اور اس بزرگی کا ذکر اُن آیات کے ذیل میں کیا جارہا ہے جہاں ملائکہ سے انسان (آدم) کو سجدہ کرنے کے لیے کہا جارہا ہے اور جہاں شیطان اس بات پر جھجکتا ہے کہ ہم فرشتے اس مشتِ خاک کو سجدہ کریں؟ شیطان نے سوال کیا تھا کہ کیا تو نے اسی کو مجھ پر بزرگی عطا کی ہے؟

۲) وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ○ (الانبیآ: ۱۰۵)

[اور ہم نے زبور میں یقیناً ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کی وراثت ہمارے صالح بندوں کو ملے گی۔]

۳) اَللّٰهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ○ (الجاثیہ: ۱۳-۱۲)

[اللہ نے تمھارے لیے سمندروں کو تسخیر کردیا تا کہ تم اس کے حکم سے اُن پر کشتی رانی کرسکو اور اُس کے فضل سے آپ بہرہ یاب ہوسکو۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اُس سب کو تمھارا تابع بنا دیا اور ان میں مفکر قوموں کے لیے نشانیاں موجود ہیں۔]

۴) لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ○ (التین: ۴)

[اور ہم نے انسان کو سب سے اچھی تقویم میں پیدا کیا۔]

۵) رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (آل عمران: ۱۹۱)

[اے ہمارے پالنے والے تو نے یہ (زمین و آسمان) بے سود اور باطل تو نہیں پیدا کیے!]

۶) هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۚ (البقرہ: ۲۹)

[وہی تو وہ خدا ہے جس نے تمھارے نفع کے لیے زمین کی کل چیزوں کو پیدا کیا۔]

یہ تو متواترات سے ہے کہ زمین کا مالک حقیقی خدا ہے، لیکن یہ زمین اور اُس کی تمام اشیا اس لیے پیدا کی گئی ہیں کہ انسان ان تمام نعمتوں سے بہرہ ور ہو اور اپنی عقل، قوتِ بازو اور کسبِ حلال سے زمین کی فیاضیوں، زرخیزیوں، پیداواری صلاحیتوں، دفینوں وغیرہ سے ذاتی اور اجتماعی آسائش کے سامان پیدا کرے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اس کی مزید تشریح کی ہے:

إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ جَعَلَهَا وَقْفًا عَلَىٰ عِبَادِهِ فَمَنْ عَطَّلَ أَرْضًا ثَلَاثَ سِنِينَ بِغَيْرِ سَبَبٍ أَوْ عِلَّةٍ أُخْرِجَتْ مِنْ يَدِهِ وَدُفِعَتْ إِلَىٰ غَيْرِهِ (وافی: ۱۳۲:۳)

[زمین اللہ عزّ وجل کے لیے ہے جسے اس نے اپنے بندوں کے لیے وقف کردیا ہے، جو کوئی اِسے کسی سبب وعلت کے بغیر تین سال تک معطل رکھے، اُس کے ہاتھ سے نکال کر دوسرے کو دے دینا چاہیے۔]

اگر زمین انسانوں کے لیے بنائی گئی اور اس کی تمام نعمتیں اُسی کے لیے خلق ہوئی ہیں، تو انسانوں نے قوی اور کمزور کے گروہ بنالیے ہیں۔ کچھ اس میں سے محنت کش ہیں، جن کا کام یہ ہے کہ بے چون و چرا دن رات بس محنت ہی کرتے جائیں اور کچھ ان کی محنت کا سب پھل لے جائیں اور ان کی قسمت میں صرف گٹھلیاں اور چھیچھڑے رہ جائیں۔ طلوعِ اسلام کے وقت صورتِ حال یہی تھی۔ قرآن نے اس کی بار بار وضاحت کی کہ اسلام کا نظامِ عدل اور انصاف پر قائم ہے:

۱) اللہ عدل وانصاف کے ساتھ قدرت کے کارخانے کو سنبھالے ہوئے ہے (قَائِمًا

بِالْقِسْطِ ۔آلِ عمران:۱۸)

۲) قُلْ اَمَرَ رَبِّی بِالْقِسْطِ قف (اے رسول کہہ دو کہ میرے رب نے تو انصاف کا حکم دیا ہے۔(الاعراف :۲۹)

۳) اِنَّ اللّٰهَ يَامُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ٥ (النحل:۹۰)

[اس میں شک نہیں کہ اللہ انصاف اور لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے اور قرابت داروں کو کچھ دینے کا حکم کرتا ہے اور بدکاری، ناشائستہ حرکتوں اور سرکشی سے منع کرتا ہے اور تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ تم سبق حاصل کرو۔] (النحل:۹۰)

اس کو دوسرے پہلو سے بھی بار بار کہا ہے کہ وہ کسی پر کسی حالت میں ظلم نہیں کرتا اور نہ اُسے یہ پسند ہے کہ کوئی کسی اور پر ظلم کرے۔ اگر کوئی پسماندہ ہے، پچھڑا ہوا ہے تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قدرت نے ایسا کر دیا ہے یا قدرت ہی اُس کی پسماندگی دور کرے گی بلکہ واضح طریقے سے یہ بتایا گیا ہے کہ

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

عدل و انصاف اور عدم ظلم کا تقاضا یہ ہے کہ راہ میں سماج کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرے اور فرد یا سماج کے کسی طبقے کی ترقی کی راہ میں روڑے نہ اٹکائے، جاہلیت کے سماج نے ایسی رکاوٹیں نا برابری کے قوانین اور رواجوں کی شکل میں عائد کر رکھی تھیں۔ اسلام نے ان کو ہٹانے اور دور کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ عدل کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ ظلم کے خلاف آواز بلند کی جائے:

۱) اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ٥ (البقرہ: ۲: ۱۹۰)

[اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔] (البقرہ: ۲: ۱۹۰)

۲) وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ٥ (البقرہ: ۲: ۲۰۵)

[خداوندِ عالم فساد کو دوست نہیں رکھتا۔] (البقرہ: ۲: ۲۰۵)

(عربی زبان میں فساد صرف جنگ و جدل نہیں بلکہ ہر طرح کی برائی کو حاوی ہے)

۳) وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ط (البقرہ: ۲: ۲۱۷)

[اور فتنہ پردازی قتل سے بھی بدتر ہے۔] (البقرہ: ۲: ۲۱۷)

۴) وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ط اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ٥ (الاعراف: ۷: ۵۶)

[اور زمین میں اصلاح ہو چکی تو اب فساد نہ پھیلاتے پھرو اور اللہ سے خوف اور امید کے جذبات کے ساتھ دعائیں مانگو کیوں کہ احسان اور نیکی کرنے والوں سے اللہ کی رحمت قریب ہوتی ہے۔] (الاعراف: ۷: ۵۶)

انصاف کا قیام اور ظلم کا استیصال فکری اور عملی مساوات کے لیے فضا ہموار کر رہا تھا۔ اس کے فروغ کے لیے فکری فروغ اور عمل کی مستحکم بنیادوں پر نئے نظام کو استوار کرنے کی حاجت شروع ہی سے محسوس کی گئی۔ اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کے دورِ خلافت کے کوفہ کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی حکومت کا سب سے بڑا فرماں روا اپنے دورِ حکومت میں یہ ضرور سمجھتا تھا کہ حاکمِ وقت ہر اعتبار سے ظلم کے استیصال کی کوشش کریں اور ایسی کوئی بات نہ ہونے دیں جس سے طبقات یا

افراد میں سرکاری برتاؤ کے ضمن میں نابرابری کا احساس پیدا ہو۔

حضرت علی علیہ السلام کے دورِ خلافت میں عثمان بن حنیفؓ بصرہ کے گورنر تھے۔ اُس وقت بصرہ کے علاقے میں خوزستان اور فارستان سے لے کر کرمان تک شامل تھا۔ عثمان دو بھائی تھے اور دونوں حضرت علی کے باوقار ساتھیوں میں تھے۔ عثمان کو اتنا بڑا وقار دے کر حضرت علیؑ نے اپنے اعتبار و اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ اس کے باوجود عثمان کے طرزِ حکمرانی اور طریقِ کار پر بھی ویسی ہی کڑی نظر رکھتے تھے جیسی دوسرے حاکموں اور عاملوں پر۔ مثلاً مشہور صحابی مالک اشتر کو ایک خط لکھا جو ''نہج البلاغہ'' میں موجود ہے اس میں انھیں ہدایت کی کہ ''جن لوگوں کو تم کسی عہدے پر مقرر کرو تو جاسوسوں اور ناشناختہ لوگوں کے ذریعے اُن کے فعل و قول پر نظر رکھو۔'' حضرت علی کی باخبر نظر عثمان بن حنیف پر بھی تھی۔

ایک بار عثمانؓ نے بصرے کے کسی مالدار نوجوان کی دعوت قبول کی اس پر تکلف دعوت میں عمائد و اشراف موجود تھے، لیکن فقیر اور نچلے طبقے کے لوگ اس میں شریک نہیں کیے گئے تھے اور یہ ایک طبقاتی جمگھٹ بن گیا تھا۔ یہ خبر پاتے ہی حضرت علیؑ نے ایک تہدیدی خط لکھا:

> ''مجھے خبر ملی ہے کہ بصرے کے ایک نوجوان نے تمھیں بلایا اور تم اس کے دسترخوان کی طرف لپک پڑے۔ مجھے تو یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ تم ایسے دسترخوان پر موجود ہو گے جس میں مالدار تو موجود ہوں اور فقرا کو بار نہ ہو۔ ذرا اِس پر تو غور کرو کیا کھا رہے ہو؟ اگر تمھیں اس کھانے کے بارے میں یہ علم نہ ہو کہ یہ کہاں سے آیا ہے اور کیا ہے تو اِسے نہ کھاؤ۔ ہاں اگر یہ معلوم ہو کہ یہ اکلِ حلال ہے تو کھا سکتے ہو۔''

''مجھے معلوم ہے کہ تم علی کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتے لیکن آؤ، میری مدد کرو۔ ورع، اجتہاد، عفت اور سداد سے'' (نہج البلاغہ: پینتالیسواں خط)۔

ظلم کے خاتمے کے لیے علم و فکر کی گہرائی بھی ضروری ہے، کیونکہ ظلم جو طریقے اختیار کرتا ہے اور جن وسائل پر قبضہ جماتا ہے ان کے علم کے بعد اُس کو ختم کرنے کی حتمی اور قطعی تدبیریں سوچی جاسکتی ہیں۔ اسطرح سماجی، سیاسی، اقتصادی، دینی ہر اعتبار سے حصولِ علم ضروری پاتا ہے۔

علم اور فکر و نظر

فطرت کی وسیع اور رنگارنگ نعمتیں انسان کو عطا کی گئی ہیں اُن سے پوری طرح مستفید ہونے کے لیے، علم اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔ انسان کو روئے زمین کی خلافت دی گئی تا کہ منشائے فطرت کے مطابق نظامِ کار اور نظامِ اخلاق چل سکے۔ اُس کو ہر طرح کی بزرگی ملی۔ اُس کو یہ صلاحیت ملی کہ وہ سمندروں، فضاؤں اور زمین کی تسخیر کر سکے اور اپنی جائز ضروریات ان سے حاصل کر سکے اور زمین و زمان میں جو اور بہت سی نشانیاں ہیں اُن کی دریافت کے لیے فکر کی دعوت دی گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کو فکر و غور کرنے کے لیے عقل کی دولت بھی دی گئی اور اس کے استعمال کی دعوتِ عام بھی۔

علم سے اعمال اور عقاید دونوں کو جلا ملتی ہے۔ علم رزق اور معاش کے راستے کھولتا ہے اور اوامر و نواہی سے آگاہ کرتا ہے۔ تسخیرِ ارض و سما کے راستے دکھاتا ہے۔ احکام قرآنی سے آشنا کرتا ہے۔ دوسروں تک خیالات کے پہنچانے اور تبلیغ و دعوت کی راہیں کھولتا ہے۔ پھر دوسروں کے فاسد خیالات سے آگاہ کر کے ان کے انسداد کی راہ دکھاتا ہے۔ اور اُس تفکّر کے قابل بناتا ہے جس کی ہمیں واضح لفظوں میں ہدایت کی گئی ہے۔ علم سے اخلاق کے سنوارنے، سابقین کے حالات معلوم کرنے اور ان سے عبرت حاصل کرنے اور اسرار و غوامضِ کائنات سے واقف ہونے میں مدد ملتی ہے۔ علم کے اور بھی بے حد

فوائد ہیں۔ جاہل اعراب کے لیے نئی روشنی اور نئی زندگی اسی علم وفکر سے مل سکتی تھی۔

صالح فکر کے فروغ اور صحیح مناسب اور فائدہ رساں عمل کی فضا تیار کرنے کے نقطۂ نظر سے ہی حصولِ علم کی اہمیت بار بار جتائی گئی ہے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی دو مبارک حدیثیں تو زبانِ زدِ خلق ہیں:

۱) طَلَبَ الْعِلْمَ فَرِيْضَةٌ علىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ و مُسْلِمَةٍ
[علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔]

۲) اُطْلُبُوا الْعِلْمِ ولَو كَانَ بالصين
[علم حاصل کرو چاہے وہ چین ہی میں کیوں نہ ملے۔]

اس آخری حدیث نے یہ واضح کر دیا کہ یہاں علم سے علوم کے سبھی شعبے مراد ہیں، ورنہ چین میں کون سا علم دین مل جاتا؟ یہ نظریہ بذات خود ترقی پسندانہ ہے، کیوں کہ ہندوستان میں علم ایک ذات والوں نے اپنے اندر محدود کر لیا تھا اور بیرون ہند بھی ریفارمیشن کے دور تک علوم وفنون پر قدغن روا رکھی گئی تھی۔ اس کے برعکس اسلام میں نہ صرف یہ کہ عام اجازت دی گئی بلکہ اسے ایک ایسا فریضہ قرار دیا گیا جو ہر مرد اور عورت پر عائد ہوتا ہے۔

اس بات کی مزید وضاحت حضرت علی کے ایک قول سے ہوتی ہے کہ علم و حکمت جس ذریعے سے بھی حاصل ہو سکے، حاصل کی جائے۔

اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَخُذِ الْحِكْمَةَ وَ لَو مِن اَهْلِ النِّفَاقِ
[حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے منافقین سے بھی حاصل ہو تو لے لو] (نہج البلاغہ)

عام دانش وروں کے یہاں بھی ان افکار کی گونج سنائی دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

اِنَّ اللّٰهَ يُحيِ الْقُلُوبَ بِنُورِ الْحِكْمَةِ كَمَا يُحيِ الْاَرْضَ بِوابِلِ السَّمَاءِ
خدا آدمیوں کے دلوں کو عقل کے نور سے اسی طرح زندہ کرتا ہے جیسے مردہ زمینیں آسمانی بارشوں سے سرسبز ہوتی ہیں۔ (بحارالانوار، حصہ اول)

علم کی خوبیاں بہت سی بیان کی گئی ہیں اور اس سلسلے میں احادیثِ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ اور اقوالِ ائمہ بکثرت آئے ہیں۔ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ نے حضرت علیؑ سے ارشاد فرمایا:

يَا عَلِيُّ ! لَا فَقْرَ اَشَدُّ مِنَ الْجَهْلِ و لَا مَالَ اَعْوَدُ مِنَ الْعَقْلِ
اے علی! جہالت سے زیادہ شدید اذیت رساں کوئی محتاجی نہیں اور عقل سے زیادہ فائدہ مند کوئی مال نہیں۔

علم کے مختلف پہلوؤں پر حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے بھی مختلف موقعوں پر زریں خیالات کا اظہار کیا ہے نہج البلاغہ میں۔ ان میں سے چند یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ مذاہب سابقہ میں اسلام کے علاوہ دوسرا مذہب نظر نہیں آتا جس نے حصول علم پر اور عقل وحکمت سے کام لینے پر اتنا زور دیا ہو۔ یہ بجائے خود ترقی پسندی کی واضح دلیل ہے:

۱) كَفاكَ مِن عقلُكَ ما اوضَحَ لَكَ مُبُلَ غيّك مِن رُشدك

[تمھاری عقل کا یہی فائدہ کافی ہے کہ اُس نے تمھاری گمرہی کا راستہ ہدایت سے واضح کر دیا۔]

۲) یـا جـابـر ! قوامُ الدّین و الدُنیا باربعَة عالِم مُستَعمِلٍ عِلمَهٗ و جاهلٍ لا یَستَـنـکِفُ اَن یَّتَـعلّـمُ جَوَادٍ لَا یبْخِلُ بِمَعْرُوفه وَ فَقِیرٍ لَایَبِیْعُ اٰخِرتِهٖ بِدُنـیـا ه فـاذا ضیـعَ الـعَالِم عِلمه اِستَنکف الجاهل اَنْ یَتَعَلَّمَ و اذا بَخِل الغَنِیُّ بِمَعْرُوفه باعَ الفَقِیر اٰخِرتهٗ بِدُنیا۔

[اے جابر! دین و دنیا کا مدار چار پر ہے۔(۱) وہ عالم جو اپنا علم کام میں لائے (۲) وہ جاہل جو (نامعلوم باتوں کے) حاصل کرنے میں عیب محسوس نہ کرے (۳) وہ سخی جو اپنی عطا میں کنجوسی نہ کرے اور (۴) وہ فقیر جو اپنی آخرت دنیا کے لیے نہ بیچے۔ جب عالم اپنا علم ضایع کرتا ہے تو جاہل تحصیل علم سے نفرت کرنے لگتا ہے اور جب سخی احسان سے ہاتھ روکتا ہے تو فقیر اپنی آخرت دنیا کے لیے بیچ ڈالتا ہے۔]

۳) الـعـلـم عِـلـمَـان مـطبـوعٌ و مسـمُـوعٌ و لَایَـنفَعُ المسموع اذالَم یَکن المطبوع۔

[علم دو طرح کے ہیں (۱) مطبوع {فطرت میں ایسا رچا بسا کہ عمل سے ظاہر ہو} اور (۲) مسموع {سن لیا مگر عمل ندارد} مسموع جب تک مطبوع نہ ہو بے فائدہ ہے۔]

۴) قَطَعَ العِلمُ عُذرَالمُعَلِّلِین۔

[علم بہانہ تراش لوگوں کے عذر کو ختم کر دیتا ہے۔]

۵) کُلُّ وِعَاءٍ یَضِیقُ بِما جُعِلَ فِیهِ اِلّا وِعَاءَ العِلمِ فَاِنَّهٗ یَتَّسِعُ بِهٖ۔

ہر برتن جو کچھ اس میں رکھا جائے اس سے بھر جاتا ہے لیکن علم کا ظرف ایسا ہے کہ (مزید) علم سے بڑھتا ہی جاتا ہے۔

یوں تو بہت سے دوسرے مواقع پر بھی حضرت علیؑ نے علم و عقل کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے، لیکن جناب کمیل بن زیادؓ سے ایک طویل خطاب کے دوران مختلف مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے مزید گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ارشاد کیا ہے:

یـا کُمیل بن زِیَادٍ ! اِنَّ هذه القلوب اَوعِیَةٌ فَخَیرُها اَوعَاها فاحفَظُ عَنِّی مَـا اَقُـولُ لَکَ : اَلنَّاسُ ثَلٰثَةٌ : فَعَالِمٌ رَبَانیٌ ومُتَعَلِمٌ عَلٰی سَبِیلِ نجاةٍ وهَمَجٌ رَّعَـاعُ اَتبَـاعُ کُلِّ ناعِقٍ یمیلونَ مَعَ کُلّ رِیحٍ لَم یَستَضِیئُوا بِنُورِ العِلمِ ولَم یَلجوا اِلی رکنٍ وثیقٍ۔

[اے کمیل بن زیاد! یہ دل برتن ہیں۔ ان میں اچھا وہ ہے جو زیادہ محفوظ رکھتا ہو۔ تم سے میں جو کہوں اسے یاد رکھو! لوگ تین قسم کے ہیں۔ عالم ربانی، نجات کے راستے کا طالب علم اور یہ کمزور اور فضول اشخاص جو ہر چیخنے والے کے پیچھے اور ہر ہوا کے ساتھ ہیں۔ ان لوگوں نے علم کے نور سے روشنی نہ لی، کسی مضبوط رکن سے پناہ نہ لی۔]

یـا کُمیل! العِلمُ خَیرٌ مِن المالِ ، العِلمُ یحرسُكَ واَنتَ تحرسُ المال والمالُ تنقُصُهُ النَّفَقةُ العِلمِ یَزکُوا عَلَی الاَنفاق و صَنِیعُ المالُ یَزُول بزواله۔

[کمیل! علم مال سے بہتر ہے کہ علم تمھاری حفاظت کرتا ہے اور تمھیں مال کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ مال خرچ ہونے سے کم ہوتا ہے اور علم استعمال کرنے سے نشو و نما پاتا ہے۔ مالی مصنوعات مال کے ختم ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔

يَا كَميل بن زِيَاد ! مَعْرِفَةُ العِلمُ دِينٌ يُدانُ به يَكْسِبُ الاِنْسَانُ الطَّاعةِ فِى حَياته وجَميلَ الاحدوثةِ بَعدَ وفَاتِهِ والعِلمُ حَاكمٌ والمَالُ مَحْكُومٌ عَلَيهِ.

[اے کمیل ! معرفت علم مذہب ہے جس کے لوگ پرستار ہیں۔ اس سے انسان اپنی زندگی میں کسبِ اطاعت کرتا ہے اور مرنے کے بعد اچھا ذکر ہوتا ہے۔ علم حاکم ہے اور مال محکوم۔ (نہج البلاغہ: ۶۳۳)

يَا كَميل بن زِيَاد! هَلَكَ خُزّان الامْوَال وهُم اَحياءٌ والعُلماء باقُون مَا بَقِىَ الدّهرُ اَعيانهُم مَفقُودةٌ واَمثالُهم فى قلوب مَوجودة . ها! اِنَّ ههُنا لِعِلماَجَمًّا (وَيَسْتَضِيُوا شَارَ بِيَدِهِ اِلى صَدرِهِ) لَواصبتُ له حَمَلَةً بلٰى اصبتُ لِقَنا غَيرَ مامونٍ عَليهِ مُستَعمِلاً اٰلَةَ الدِين بِالدُّنيا مِستظهِراً بِنِعمِ اللّٰهِ عَلٰى عِبادِهِ وحُجَجهِ اِلىٰ اولِيَائِهِ او منقاداً لحملة الحق لابَصِيرة لَهُ فى اَحِنَائِهِ يَنْقَدِحُ الشَّكُ فى قلبِهِ لِاَوّلِ عارضٍ مِن شُبهَةٍ الاذَاو لاذاك او مَنهوماً با للَّذَّةِ سَلِسَ لِلقياد للشهوَة او مُغرِماً بالجمع والادخارِ ليسامن رعاة الدينِ فى شىءٍ اَقربُ شىءٍ شبهابِهِما الانعامُ السائِمةُ كذالكَ يَموتُ العلمُ بِموتِ حامليه (نہج البلاغہ: صبحی صالح: ۶۳۴)

[اے کمیل! مالوں کو خزانوں میں بھرنے والے جیتے جی ہلاک ہوگئے اور علما رہتی دنیا تک باقی ہیں۔ اُن کی اجسام اُٹھ گئے ہیں مگر اُن کی تصویریں دلوں میں موجود ہیں۔

[یاد رکھو! یہاں (اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بے انتہا علم ہے کاش اس کو اٹھانے والے مل جاتے۔ ہاں کچھ حاصل کرنے کے شوقین ہیں، لیکن ان کے لیے اطمینان نہیں کیوں کہ یہ لوگ دین کو (تحصیل) دنیا کا آلہ بنانے والے ہیں۔ وہ خدا کی

نعمتوں کو بندوں پر جتانے والے ہیں اور اس کی حجتوں کو (عقل وعلم) سے اولیاء اللہ پر برتری چاہنے والے یا پھر ایسے ہیں جو حق کے پرستار تو ہیں مگر ان کے گوشۂ دماغ میں بصیرت نہیں۔ پہلا شبہ جوان کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ شک کی چنگاریاں چمکا دیتا ہے لیکن دونوں میں سے کوئی اس علم کے قابل نہیں۔ ان کے علاوہ وہ ہیں جو لذتوں کے بے حد شوقین ہیں، خواہشات کے جلد مطیع ہونے والے یا جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے اور ذخیرہ اندوزی پر فریفتہ ہیں۔ یہ دونوں (عیاش اور زراندوز) بھی دین کے محافظ اور کسی کام کے نہیں ہیں۔ ان کے ملتے جلتے تو پھرتے رہنے والے جانور ہیں اور اسی وجہ سے (یعنی عالم کو صحیح وارث نہ ملنے سے) علما کے ساتھ علم بھی مرجاتا ہے۔

حضرت علی ابن ابوطالب علیہ السلام نے فرمایا:

۱۔اَوضعُ العلمِ ما وُقِف علی اللِسانِ و اَرفَعَهٗ ما ظَهرَ فى الجوارِحِ و الاركان.

[سب سے عمومی درجے کا علم وہ ہے جو صرف زبان پر رک جائے۔ بلندترین علم وہ ہے جو اعضا اور جوارح (عمل) سے ظاہر ہو۔ (نہج البلاغہ: حکمت: ۸۶)]

۲۔لَاتَجعلوا عِلمَكُم جَهلاً و يَقينكُم شَكاً ج اِذاعَلِمتم فاعملوا و اذاتَيَقَّنتُم فاقدموا.

[علم کو جہالت اور اپنے یقین کو شک نہ بناؤ۔ جب علم حاصل کرلیا تو عمل کرو اور یقین ہوگیا تو اقدام کرو۔ (نہج البلاغہ: کلمات قصار: ۲۷۴)]

حضرت کمیل کو مخاطب کر کے حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد کیا:

۳۔لاتَخلُواالارضَ مِن قائمٍ لِلّٰهِ بِحجَةٍ اِما ظاهراً مَشهوراً و اِمّا خَائِفاً مَغموراً ، لِئَلّاتَبطُل حُجج اللّٰهِ وبَيّناتهِ وكم ذاوَاين؟ اولٰئِك واللّٰهِ الاَقلَونَ عَدَداً والاعظَمُون عنداللّٰه قدراً يَحفَظُ اللّٰهُ بِهِم حُجَجة وبيّناتَهٗ حتّىٰ يُودَعُوهانُظَرهُم ويَزْرَعُوها فى قلوب اَشباهِهِم هَجَمَ بِهِمُ العِلم عَلىٰ حَقِيقَةُ البَصيرةِ و باشَرُوا رَوح اليَقِين واستنالوا ما استعورهُ المُترفُونَ واُنسوبِمااستوحَشَ مِنهُ الجاهِلُون وصَحُبوالدنيابِاَبدان اَرواحُها مُعَلَّقَةٌ بِالمَحَلِّ الاَعلىٰ اُولٰئِك خُلَفَاءُ اللّٰهِ فى ارضهِ والدُّعاةُ اِلى دينِهٖ اٰهُ اٰهُ شَوقاً اِلى رُويتِهم اِنصرِف يا كميل! اذا رشئت (نہج البلاغہ:۴۹۷)

[زمین حجت خدا سے خالی نہیں رہتی۔ یا وہ ظاہر و معلوم ہوگا یا خوف سے پردے میں ہوگا۔ اور یہ اس لیے ہے کہ کہیں حجت الٰہی اور بیّنات خداوندی سے زمین خالی نہ ہو جائے۔ یہ لوگ کتنے ہیں اور کہاں ہیں؟ یہ لوگ بخدا عدد میں کم ہیں اور خدا کے یہاں عزت میں زیادہ ہیں، جن سے خدا اپنی حجتوں اور آیتوں کی حفاظت کرتا ہے۔ جب تک کہ وہ اپنے جیسے کو وہ امانت سپرد نہیں کر دیتے۔ وہ ان حقائق کو اپنے جیسے منصب دار کے دل میں بو دیتے ہیں ان پر بصیرت اور علم حقیقی ایک ساتھ نازل ہوتا ہے۔ یہ لوگ سکون یقین سے جا ملتے ہیں اور عشرت پسند انسانوں کی سختیاں نرم کر لیتے ہیں جس سے جاہلوں کو وحشت ہوتی ہے، یہ اس سے مانوس ہوتے ہیں۔ دنیا میں ایسے جسموں کے ساتھ رہتے ہیں جن کی روحیں منزل بلند میں رہتی ہیں۔ یہ زمین پر نائبین خدا ہیں اور اس کے دین کے داعی رہے ہیں ان سب کو دیکھنے کا شوق ہے۔ اچھا کمیل! جب چاہو جا سکتے ہو۔]

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

۴۔لَا مَالَ اَعْوَدُ مِنَ العَقلِ وَلَاوحِدَةَ اَوحَشُ من العُجب وَلَاعقل

كَالتدبير و لَاكرم كَاالتقوىٰ ولاميراث كَاالارب ولاقائدَ كَاالتوفيق لاتجارة كَاالعمل الصالح ولارِبحَ كَاالثواب ولاوَرَعَ كَاالوقوف، ولازُهد كَاالزهدِ فى الحرام ولاعلم۔ كَاالتفكر وَلاعبادة كَاَدَاءِ الفرائضِ ولا ايمان كَاالحياء والصّبرُ وَلاحَسِب كَاالتواضُع وَلاشرَف كَاالعلم ولامُظاهِرَة اَوْثق من المشاورة (نہج البلاغہ:۹۲۴)

[عقل سے زیادہ مفید کوئی مال نہیں اور خود پسندی سے زیادہ وحشت خیز کوئی تنہائی نہیں، تدبیر سے بہتر عقل نہیں، تقویٰ سے بہتر کرم نہیں، تہذیب و ادب کے مقابلے میں کوئی ترکہ نہیں، توفیق سے اچھا کوئی رہنما نہیں، نیک عمل سے اچھی کوئی ریت نہیں، ثواب سے بہتر کوئی منافع نہیں۔ ورع کا مطلب ہی یہ ہے کہ شبہ کو ٹھہرایا جائے، حرام سے بچنے سے بہتر کوئی زہد نہیں، فرائض کی ادائیگی سے بہتر کوئی عبادت نہیں، ایمان کی حقیقت ہے حیا اور صبر۔ انکسار سے اچھا کوئی شرف نہیں اور علم سے بہتر عزت نہیں۔ مشورے سے بہتر کوئی اقدام بھروسے کے قابل نہیں۔]

علم و فکر و عمل کے ساتھ ساتھ عدل کی بھی اہمیت ہے اور حضرت علیؑ نے عدل کے چار شعبے بتائے ہیں:

۵۔والعدلُ مِنها على اربع شُعب۔ علىٰ غائصِ الفهمِ و غَورِ العلمِ وزُهرَة الحُكمِ ورَساحة الحلم۔ فَمن فَهم عَلِمَ غَورَ العلمِ ومن عَلمَ غورَ العلمِ صَدَر عن شرائع الحكمِ و مَن حَلُمَ لم يُفرّط فى اَمره وعاش فى الناسِ حميدا (نہج البلاغہ:۶۰۷: کلمات قصار:۳۱)

[عدل کے چار شعبے ہیں۔ سمجھ کی باریک بینی، علم کی گہرائی، فیصلوں کی خوبی، علم میں ثابت قدمی، یعنی جس نے باریک بینی سے کام لیا اس نے علم کی گہرائی پائی اور جو علم کی

گہرائی پا گیا وہ (صحیح) فیصلوں کی گھاٹیوں سے سیر و سیراب پلٹا اور جس نے حلم کو اپنایا وہ اپنے معاملے میں حد سے آگے نہیں بڑھا اور اس نے لوگوں کی نظر میں قابل تعریف زندگی گزاری۔]

سفر تو سبھی کو کرنا پڑتا ہے لیکن حضرت علی علیہ السلام نے اس بات کا بھی اشارہ کیا ہے کہ عقل مند کو کن مقاصد کے تحت سفر کرنا چاہیے:

۶۔ لَیسَ لِلعَاقِلِ اَن یَکُون شاخِصاً اِلَّا فی ثلاثة مَرَمةٍ لِمَعاش، اَوخُطوَةَ فی معاد اَولَذَة فی غیر مُحَرمٍ (نہج البلاغہ: کلمات قصار: ۳۹۰)

[عقل مند کو صرف تین مقاصد کے لیے سفر کرنے کا حق ہے۔ اصلاح معاش، ثواب آخرت کے لیے اور ان چیزوں سے لذت و آسائش حاصل کرنے کے لیے جو حرام نہیں کی گئی ہیں۔

علم و عمل کے باہمی تعلق پر بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ ہی کا قول ہے کہ بے عمل کے دعوت عمل دینے والا بے تیر کا تیر انداز ہے۔ اس گفتگو کو سمیٹنے سے پہلے چند احادیث شریفہ اور اقوال مبارکہ اور نقل کرنے کے قابل ہیں:

ثُلثٌ تخرق الحُجُبَ وتَنتَهِي اِلٰی مابَینَ یَدی الله : صریر اَقلام العُلَماء ووطی اقدام المجاهدین و صوت المغازل المحصَنات۔

[تین چیزیں حجابات کو اُٹھاتی ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں حضوری کا شرف بخشتی ہیں:
۱۔ لکھتے وقت ارباب علم کے قلم کی آواز۔ (۲) مجاہدہ کرنے والوں کے قدموں کی چاپ اور (۳) پاک دامن عورتوں کے چرخہ چلانے کی آواز۔ (الشہاب فی الحکم والادب)

امام محمد تقی علیہ السلام کا قول ہے:

مَن عَملَ عَلٰی غیر عِلمٍ اَفسَدَ اَکثَر مِما یَصَاح

[جو شخص علم اور معلومات کے بغیر عمل کرے گا وہ خیر سے پہلے شر کا باعث بنے گا۔ (منتہی الآمال)]

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

العَاقِلُ یَعتَمِدُ عَلٰی عَمَلِهِ والجَاهِلُ یَعتَمِدُ عَلٰی اَمَلِهِ

[عقل والا اپنے عمل اور کوشش پر بھروسا کرتا ہے اور جاہل اپنی خواہشوں کا دست نگر ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا ہے:

فضل الفَقیهِ عَلَی العابِدِ کَفضل الشَّمسِ عَلَی الکَوَاکِب

[عالم (فقیہ) کو عابد پر ویسی ہی فضیلت حاصل ہے جو سورج کو ستاروں پر ہے۔ (تحفۃ العقول)]

ان بیانات سے جو رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں اور ائمہ کرام کے اقوال کا مجموعہ ہیں، یہ بات بالکل واضح اور روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام غور و فکر کی دعوت عام دیتا ہے اور اندھی تقلید کا قائل نہیں ہے۔ خود اجتہاد کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ غور و فکر ایک مسلسل عمل ہے جو ہر دور اور ہر زمانے میں جاری اور ساری رہتا ہے۔ انفرادی غور و فکر کے علاوہ اسلام نے باہمی مشورہ کا بھی مشورہ دیا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کا فرمان ہے:

مَاتَشَاوَرَ قَومٌ اِلَّا هَدَوْ اِلٰی رُشْدِهِمْ

[جس جماعت نے بھی اپنے مسائل میں باہم مشورہ کیا اس سے ان کے لیے بھلائی اور رہنمائی ہوئی۔] (تحفۃ العقول:۱۶۴)

عمل

انسانی زندگی کے لیے صرف فکر اور علم ہی کافی نہیں ہیں بلکہ اسی کے پہلو بہ پہلو عمل کی بھی ضرورت ہے۔ عمل کی ضرورت پر قرآن مجید میں بار بار زور دیا گیا ہے اور صاف لفظوں میں بتا دیا گیا ہے کہ: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى o (النجم:۳۹) یعنی انسان کو اس کے سوا جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور کچھ نہیں مل سکتا۔ اس کے لیے بس اتنا ہی ہے۔ جو اسے سعی و کوشش سے حاصل ہو۔ دوسرے مقامات پر بھی قرآن کریم نے عمل اور نیک عمل کا پیغام دیا ہے۔

۱) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ o (البقرہ: ۶۲)

[بیشک جو لوگ ایمان لا چکے اور یہودی ہو گئے اور نصاریٰ اور صابی غرض جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائے اور اس نے نیک عمل کیے، ان کے لیے، ان کے رب کے پاس سب کا اجر ہے۔ اور ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی اندیشہ۔] (البقرہ: ۶۲)

۲) وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ (البقرہ:۲۵)

[اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، بشارت دے دو کہ ان کے لیے ایسی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔]

۳) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ o (البقرہ:۸۲)

[اور جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے وہی اہل جنت ہیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔]

۴) وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ o (البقرہ:۱۳۹)

[اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال اور ہم تو اسی کے مخلص ہیں۔]

عمل کی اہمیت اتنی ہے کہ اس کے بغیر حصول جنت ممکن نہیں ہے۔ صرف علم کافی نہیں ہوگا۔ صرف آیاتِ الٰہی کے بارے میں غور و خوض کافی نہیں ہوگا۔

اصلی کسوٹی اچھے اعمال کی ہے اور اچھے اعمال کی کسوٹی وہ اقدار اعلیٰ اور وہ فلسفۂ حیاتِ اجتماعی ہے جو اسلامی تعلیمات کی بنیاد ہے۔ ان اعمال کی نوعیت اور اچھے اور برے اعمال کی طرف بھی صاف صاف اشارے کیے گئے ہیں اور آئندہ صفحات میں ہم اس سے گفتگو کریں گے۔ یہاں صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ اسلام ایک طرف بے سوچے سمجھے، بھیڑیا دھسان عمل کا مخالف ہے اور جذبات کی رو میں بہہ جانے والے عمل کے خلاف اپنے پیروؤں کی تنبیہ کرتا ہے تو دوسری طرف وہ ایسے علم کی مخالفت کرتا ہے جو

عمل سے بالکل کنارہ کش ہو، جو عام عملی زندگی سے ہٹا کر بے جا تیاگ اور رہبانیت کی طرف ڈھکیل دے اور اس طرح اس علم سے جو کم علم اور کم تجربہ رکھنے والے افراد کو جو رہنمائی مل سکتی ہو وہ اس سے محروم ہو جائیں۔

حضرت علی ابن ابی طالب کی زندگی میں علم وعمل کا حیرت انگیز امتزاج ملتا ہے۔ ہم ابھی سطور گذشتہ میں علم وفکر کے بارے میں خود ان کے اور بعض اہل خاندان کے افکار کی ایک جھلک دیکھ چکے ہیں۔ انھوں نے ''نہج البلاغہ'' میں جگہ جگہ عمل کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے۔ بے شبہ اس میں قرآن حکیم اور رسول کریم کی تعلیمات کی گونج بھی سنائی دیتی ہے، کیوں کہ یہی دو منابع حضرت علیؑ کی فکر کے محور ہیں۔ مثلاً حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کی مشہور حدیث ہے:

اِنَّ اللّٰہ لا ینظر اِلی صُورکُم وَلَا اِلی اَموَالِکُم وَاِنَّما ینظر اِلی قُلُوبکُم و اعمالکم۔

[اللہ تعالیٰ نہ تمھاری صورتوں کو دیکھتا ہے نہ تمھارے مال و دولت کو، وہ تو تمھارے دلوں اور تمھارے کاموں کو دیکھتا ہے۔] (محجۃ البیضا: ۳۱۲)

اب ضرورت اعمال کی علوی تفسیر کے چند اجزا ملاحظہ کیجیے:

۱) وَالفُرصَۃُ تَمُرّ مَرّ السحاب فانتَھِزُوا فُرصَ الخَیر۔

۱) فرصت کی گھڑیاں (تیز رفتار) ابر کی تیز رفتاری سے گزرتی ہیں، جو لمحہ بھی تمھیں مل جائے اسے غنیمت جانو۔

۲) مَن اَبطأَبِہٖ عمَلُہٗ لَم یُسرع بِہٖ نَسَبُہٗ۔

۲) جسے اس کے اعمال پیچھے ہٹا دیں، اسے حسب ونسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔

۳) لَایَقِلُّ عَمَلٌ مَعَ التَّقویٰ و کیف یَقِلُّ مایُتَقَبَّلُ۔

۳) جو عمل پرہیزگاری کے ساتھ کیا جائے اسے تھوڑا نہیں سمجھنا چاہیے اور مقبول ہونے والا عمل بھلا کیسے تھوڑا ہو سکتا ہے۔

۴) لَانسُبَنَّ الاَسلام نِسبَۃً لَم یَنسُبھا اَحَدٌ قبلی۔ الاسلام ھُوَ التسلیم، التسلیم ھُوَ الیقین۔ والیقین ھو التصدیق والتصدیق ھُوَالاِقرارُ ھوالاداءُ ھوالعمل۔

۴) میں اسلام کی ایسی تعریف بیان کرتا ہوں جو میرے پہلے کسی نے بھی بیان نہیں کی۔ اسلام سر تسلیم خم کرنا ہے اور سر تسلیم جھکانا یقین ہے اور یقین کا مطلب تصدیق ہے اور تصدیق کے معنی اقرار کے ہیں اور اقرار واعتراف کا مقصد فرض کی بجا آوری ہے اور فرض کی بجا آوری عمل ہے۔

دوسرے لفظوں میں حضرت علیؑ نے اسلام اور عمل کو ایک ہی تصویر کے دو رُخ قرار دیا:

۵) مَن قَصَّر فی العَمَلِ ابتلی بالھم۔

۵) جو عمل میں کوتاہی کرتا ہے وہ رنج واندوہ میں مبتلا ہوتا ہے۔

۶) لَاتکُن مِمَّن یَرجُواالآخِرۃ بغیر العمل۔

۶) تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو عمل کے بغیر حُسن انجام کی تمنا کرتے ہیں۔

٧) لَاتَجعَلُوا عِلمکم جهلاً وَيَقِينَكم شكاً اِذا عَلِمتُم وَاعمَلُوا واذايَقنتم فاقدموا.

٧) اپنے علم کو جہالت اور اپنے یقین کو شک نہ بناؤ۔ جب علم حاصل کرلیا تو عمل کرو اور جب یقین پیدا کرلیا تو آگے بڑھو۔

٨) الدَّاعی بلا عملٍ کالراعی بلا وتر.

٨) بے عمل کیے دعا مانگنے والا، چلہ کے بغیر تیر چلانے والے کی طرح ہے۔

٩) اَلعِلمُ مَقرُونٌ بالعمل، فَمَن عَلِمَ عَمِلَ.

٩) علم عمل سے وابستہ ہے۔ اس لیے جو جانتا ہے وہ عمل بھی کرتا ہے۔

١٠) افعلوا الخيرَ وَلاتَحقِروا مِنهُ يَشاءً فَاِن صغيره كبيره وقليله كثيره.

١٠) اچھے کام کرو اور تھوڑی سی بھلائی کو بھی حقیر نہ جانو۔ چھوٹی سی نیکی بھی اور تھوڑی سی بھلائی بھی بہت ہے۔

حضرت علیؑ کے نزدیک علم ایک خیر جاری ہے۔ اسے ذہن بذہن منتقل ہوتے رہنا چاہیے تاکہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے علم میں اضافہ ہوتا جائے۔ علم کو سینے کا دفینہ بنا کر محدود نہیں کرنا چاہیے، بلکہ منظم طریقے سے اس کے استمرار ودوام کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اگر علم کو محدود کیا گیا تو علم صحیح ورثا کے نہ ملنے اور آگے لے چلنے والوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے مرجاتا ہے۔ اسی لیے جس طبقے نے سنسکرت کے علم کو محدود کرنے کی

کوشش کی، وہ اجارہ دار تو بن بیٹھے، لیکن علم کی ترقی بالکل رک گئی اور زبان اپنی وہ فعالیت کھو بیٹھی جس نے اسے دنیا کی ایک بڑی زبان بنا دیا تھا۔ لاطینی اور یونانی زبانوں کا بھی یہی حال ہوا کیوں کہ عوام سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا اور یہ اشرافیہ کی زبانیں بن گئیں۔ اسلام نے عربی زبان کے فروغ و ترویج کے ساتھ عوامی زبانوں کے ساتھ بھی دوستانہ سلوک کیا اور ہر زبان کو اپنے پیغام کے پہنچانے کے لیے استعمال کیا تاکہ علم عام ہو اور محدود ہو کر نہ رہ جائے۔

جنگ بدر کے بعد جو قیدی لائے گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے ان میں جو اہل علم تھے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان سے تعلیم کا کام لیا جائے۔ ان لوگوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کے چچا جناب عباسؓ بھی شامل تھے۔ اس طرح مختلف طریقوں سے مساجد میں تعلیم کا انتظام کر کے علم کو فروغ دیا گیا اور جاہل عوام شوق سے لکھنے پڑھنے لگے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس بات پر زور دیا ہے کہ کوئی بھی عمل کرنے سے پہلے اس کے مالہٗ و ماعلیہ سے واقفیت حاصل کرلی جائے۔ تجارت ہو، صناعی ہو، دوسرے ممالک کا سفر ہو، نو آبادی قائم کرنا ہو، زراعت ہو، باغبانی ہو، غرض کسی کام کو اس کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت حاصل کیے بغیر شروع نہیں کرنا چاہیے، جو شخص معلومات حاصل کیے بغیر کوئی اقدام کرے گا تو وہ خیر سے پہلے غم کا سبب بنے گا۔ مثلاً تجارت یا زراعت تو اس کو بغیر جانے آنکھ بند کر کے اختیار کرلینے سے یہ خطرہ درپیش ہوگا کہ نادانستگی میں فائدے کی جگہ نقصان کا سامنا ہو۔

ارباب علم کے صریر کلک سے حجابات کے اٹھانے میں مدد ملتی ہے۔ ارباب دانش کو اپنا علم تحریر کے ذریعے دوسروں تک پہنچانے کی تحریک سے پیغمبر خدا نے حصول علم کے ساتھ اس کی ترویج اور توسیع پر بھی زور دیا۔ اس طرح نئے ادیبوں، شاعروں، مفکروں،

جامعین احادیث اور مفسرین کلام پاک کا ایک اٹوٹ سلسلہ قائم ہوگیا۔ یہ فروغ علم بوریا نشین علما انجام دے رہے تھے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ اور آل رسول علیہ السلام سے ایسے علما کی ہر نہج سے ہمت افزائی کی گئی اور اسلام اور مسلمانوں میں تدریس وتعلیم کی ایک رو چل پڑی۔

اسی رو سے حجاز ویمن وعراق ومصر ہی نہیں بلکہ یورپ کے اندھیرے براعظم تک روشنی پہنچی اور مغرب میں بھی علم کی سمت پیش رفت ہونے لگی۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ علم ایک خیر جاری ہے اور اس خیر کو اور تیزی سے ایک نہ ٹوٹنے والے بہاؤ کی طرح ہمیشہ جاری رہنا چاہیے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ مسلمان اس بہاؤ کو جاری نہ رکھ سکے اور آج کئی مسلم ممالک اور مسلمانوں کی اکثریت والے علاقوں میں صورت حال دردناک ہو چلی ہے، جس نے علم کے ساتھ عمل سے غفلت برتی اس نے اپنے لیے نہیں، بلکہ پورے سماج کے لیے گویا بدنصیبی خریدی۔ علم کے بغیر غور وفکر کے سبھی دروازے بند بھی تو ہوجاتے ہیں۔

یہ عمل جو نیکی اور بھلائی کا ہے، اسی سے بنی نوع انسان کی بھلائی ہوسکتی ہے۔ خیر ونیکی کی بنیاد عمل صالح پر ہے۔ عمل صالح ہی کی دوسری شکل تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ یہ اسلامی اخلاق کے بنیادی پتھر ہیں، جن کو اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جاسکتا۔ اسی پس منظر میں خدا نے زمین کی وراثت کو صالح بندوں کے لیے مخصوص کیا ہے۔ بے عملی اور ترک دنیا سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا ہے۔ بے کمان کے تیر چلانا اور عمل کے بغیر صرف دعاؤں سے مقاصد اور ہدف کا حاصل کرنا ناممکن ہے۔ یہی عمل کا وہ پہلو ہے جو اقبال کے یہاں شعری پیغام بن گیا ہے۔

اسلام کی ترقی پسندی کا ایک اہم ستون وہ اہمیت ہے جو عمل صالح کو دی گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات نہ صرف مابعد الطبیعاتی محور پر گردش کرتی ہیں اور نہ ماورائی رسوم پر۔

یقیناً اسلام میں عبادات پر بڑا زور دیا گیا ہے اور یہاں تک کہہ دیا گیا کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُونِ o (ہم نے جن اور انسان اسی لیے پیدا کیے ہیں کہ وہ عبادت کرتے رہیں) لیکن اس محل پر ایک لمحے رک کر اس پر غور کرلینا چاہیے کہ اس دین میں ''عبادت'' کا مفہوم کتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے۔

اہم مذاہب عالم میں (جس میں اسلام بھی شامل ہے) عبادات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انسانی زندگی کی تنظیم، ڈسپلن اور انضباط کے لیے صدیوں میں کئی طریقے رائج کیے گئے۔ روزہ، نماز، حج وغیرہ میں انفرادی اور اجتماعی، روحانی، نفسیاتی اور جسمانی مصالح پوشیدہ ہیں، لیکن یہاں ان کی تشریح وتفسیر کا محل نہیں ہے۔ یہاں کہنا صرف یہ ہے کہ اسلامی اصطلاح عبادت کو پوجا پاٹ کا مترادف سمجھ لینا، یا انگریزی Prayer اور Worship کے ہم معنی قرار دے لینا غلط ہوگا۔ اسلام نے عمل کی طرح عبادت کے مفہوم میں بھی بڑی وسعت اور لچک رکھی ہے۔ جب اسلام میں یہ تاکید کی جاتی ہے کہ عبادت کرنا فرض ہے، یا یہ بتایا جاتا ہے کہ عبادت ہی انسان کی خلقت کی علت غائی ہے تو ساتھ ہی ساتھ عبادت کی مختلف صورتیں بھی ہمارے سامنے پیش کردی جاتی ہیں اور ان صورتوں کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے۔

ذیل میں جو قرآنی آیات اور احادیث رسول یا اقوال ائمہ پیش کیے جائیں گے ان سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ عبادت میں سماج کی اقتصادی اور معاشی بہتری کے اقدامات بھی اسی طرح شامل ہیں جیسے اخلاقی اصلاح اور سدھار کے۔ یہ ایک نئے ترقی پسندانہ نظام کی تشکیل کا عمل ہے جو رضائے خدا کے لیے کیا جارہا ہے۔ تاکہ مناقشات اور فسادات، تنازعات اور بے انصافیاں مٹیں اور انسان ایک بہتر زندگی برتنے کے قابل ہوسکے۔

عبودیت کی روح اور عبادت کی حقیقت، خدا کے احکام کی پابندی، نیک امور

سے وابستگی اور بُری باتوں سے دوری میں چھپی ہوئی ہے۔ان میں وہ تمام امور آ جاتے ہیں جن کا تعلق خالق ومخلوق سے ہے، یا باہمی سماجی معاملات سے ہے یا خود انسان کی ذات سے۔قرآن اور حدیث سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔قرآن مجید میں عبادت کے مفہوم کی اس وسعت کو یوں بیان کرتے کیا گیا ہے:

۱) لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۷۷)

(۱) نیکی کچھ یہی تو نہیں ہے کہ (نماز) میں اپنے منہ پورب پچھم کرلو بلکہ نیک تو وہ ہے جو خدا، آخرت کے دن، ملک اور انبیا پر ایمان لایا اور اللہ کی محبت میں اپنا مال قرابت داروں، یتیموں، مسافروں اور سوال کرنے والوں پر اور کنیزوں اور غلاموں کے آزاد کرنے میں صرف کرتا ہے اور نماز کا پابند ہے، زکوۃ دیتا ہے، وعدہ کرنے پر پورا بھی کرتا ہے اور تنگی، تکلیف اور جہاد کے کٹھن وقت میں ثابت قدم رہتا ہے۔یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایمان کے دعوے کو سچ کر دکھایا اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

قرآن کریم میں کئی مقامات پر عبادت کی تاکید کے پہلو بہ پہلو اعمال نیک کا اس طرح اظہار کیا گیا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا روح احکام قرآنی سے بے خبری کا ثبوت دینا ہے:

۲) وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝ۙ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ (النسآء:۳۷-۳۶)

(۲) اور خدا ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور رشتہ دار، پڑوسیوں اور اجنبی پڑوسیوں اور جلو میں بیٹھنے والے مصاحبوں اور مسافروں اور زرخرید لونڈی غلاموں کے ساتھ احسان کرو بے شک خدا اکڑ کے چلنے والوں اور شیخی بگھارنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔یہ وہ لوگ ہیں جو خود تو بخل کرتے ہیں اور اس مال کو جو خدا نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے، چھپاتے ہیں تو ہم نے ان نعمتوں کو جھٹلانے والوں کے لیے سخت ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۳) وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (الاعراف:۸۵)

(۳) اور ہم نے مدین والوں کے پاس ان کے بھائی شعیب کو (نبی) بنا کر بھیجا تو انھوں نے کہا کہ، اے قوم! اللہ کی ہی عبادت کرو (کیونکہ) اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں اور وہ تمہارے پاس تو ایک واضح معجزۂ الٰہی بھی آ چکا تو ناپ تول پوری کیا کرو اور لوگوں کو ان کا خریدا ہوا مال کم نہ دیا کرو اور روئے زمین پر اصلاح و دوستی کے بعد فساد پھیلاتے نہ پھرو۔اگر تم ایماندار ہو تو تمھارے لیے یہی بہتر ہے۔

حضرت شعیب کا واقعہ سورۂ ''ہود'' میں بیان کیا گیا ہے اور تفصیلات کچھ زیادہ

ہیں مگر وہاں بھی عبادت کے ساتھ اعمال صالحہ پر اسی طرح زور دیا گیا ہے:

٤) يَـاَيُّهَـا الَّـذِيۡنَ اٰمَنُوا ارۡكَعُوۡا وَاسۡجُدُوۡا وَاعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ وَافۡعَلُوا الۡخَيۡرَ لَـعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۝ وَجَـاهِدُوۡا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَاجۡتَبٰكُمۡ وَمَا جَعَلَ عَـلَيۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ هُـوَ سَمّٰكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۙ مِـنۡ قَبۡـلُ وَ فِـى هٰذَا لِيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِيۡدًا عَلَيۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَـاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوۡلٰكُمۡ ۚ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰى وَنِعۡمَ النَّصِيۡرُ ۝ (الحج: ۷۸-۷۷)

(۴) اے ایمان والوں! رکوع کرو، سجدے کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور نیکی کرو تاکہ تم فلاح پاؤ (کامیاب ہو) اور اللہ کی راہ میں اسی طرح جہاد کرو جو جہاد کرنے کا حق ہے۔ اسی نے تم کو برگزیدہ کیا اور دین کے امور میں تم پر کسی قسم کی سختی نہیں کی۔ اور تمھارے باپ ابراہیم کا مذہب (تمھیں دیا) اور اس نے پہلے ہی سے تمہیں مسلمان (فرمابردار بندے) کا نام دیا تاکہ رسول تمھارے گواہی دے سکیں اور تم تمام لوگوں کے مقابلے میں گواہی دے سکو۔ پس نمازیں قائم کرو، زکوۃ دو اور خدا ہی کو مضبوطی سے تھام لو۔ وہی تمہارا سرپرست ہے اور کیا ہی اچھا سرپرست اور کیا ہی اچھا مددگار ہے وہ۔

حضرت شعیب کا قصہ سورۃ العنکبوت میں بھی دہرایا گیا ہے اور وہاں شعیب کی زبانی ارشاد ہوا ہے:

٥) فَـقَـالَ يٰـقَـوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَارۡجُوا الۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَلَاتَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ۝ (العنکبوت: ۳۶)

(۵) پھر (شعیب نے) کہا کہ اے قوم! اللہ کی عبادت کرو اور آخرت کے دن کی امید رکھو اور روئے زمین میں فساد نہ پھیلاتے چلو۔

احادیث رسول میں یہ بات اور شرح وبسط سے سامنے آتی ہے اور عبادت کی

اسلامی اصلاح کی وسعت کا کچھ اور اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں سرِفہرست یہ حدیثِ نبوی ہے کہ "اَلۡعِبَـادَةُ سَبۡعُونَ جُزۡ اءً اَفۡضَلُهَاطَلَبُ الۡحَلَال [عبادت کے ستر جزو ہیں۔ ان میں سب سے بہتر حلال طریقوں سے رزق حاصل کرنے کی طلب ہے]۔ اس سے یہ بات آشکار ہوگئی ہے کہ اس اصطلاح کے وسیع مفہوم میں کم از کم "طلبِ حلال" تو شامل ہی ہے۔ ایک اور حدیث میں طلب حلال کو فرائض کے بعد کا فریضہ کہا گیا ہے:

٦) عَدۡلِ سَاعةِ خيرٌ مِن عِبَادةِ السِنهِ۔

(٦) ایک گھڑی کا عدل وانصاف ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ (نہج البلاغہ: ۴۱۰)

٧) طَلَب الحلال فَرِيضَةٌ بَعدَ الفَرِيضَةِ (حديثِ رسول: بحارالانوار)

(۷) حلال کی طلب بھی فرائض (نماز روزہ وغیرہ) کے بعد فرائض میں داخل ہے۔

٨) حَـقُّ الـوَالِـدَيـن اَفۡـضَـلُ مِـنَ الـصَّـلٰوةِ وَ الصَّومِ وَ الۡحَجِّ وَ العُمۡرَةِ وَ الجِهَادِ فِى سبيل اللّٰه۔ (حدیثِ رسول: محجۃ البیضا ۲: ۲۵۹)

(۸) والدین کا حق نماز، روزہ، حج، عمرہ اور راہِ خدا کے جہاد سے افضل ہے (اس افضلیت کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص ظاہری طور پر نماز، روزہ، حج وغیرہ بجالاتا ہے مگر والدین کے حقوق سے روگردانی کرتا ہے تو وہ روح عبادت کو ہاتھ سے کھو دیتا ہے۔ اس کی نیت عبادت مشکوک ہوجاتی ہے۔)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے عبادت کرنے والوں کو تین گروہوں میں تقسیم کردیا ہے:

٩) قَـوم عَبَـدوا الـلّـه خَوفاً فَتِلۡكَ عِبَادَةُ العَبِيد و قَوم عبدوا اللّٰه طَلَبَ الثَّواب فَتِلۡكَ عِبَـادة الاُجـراء و قـوم عبـدوا الـلّـه حياً له فَتِلۡكَ عِبَادة الاَحرار۔

(۹) [ایک وہ گروہ جو خوف کی بنا پر عبادت کرتا ہے۔ یہ غلاموں کی عبادت ہوئی۔ دوسرا گروہ جو ثواب حاصل کرنے کے لیے عبادت کرتا ہے۔ یہ مزدوروں کی عبادت ہوئی۔

تیسرا گروہ اُن کا ہے جو اللہ کے عشق میں اس کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ بےلوث اور آزاد عبادت گزار ہیں۔]

اب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کی کچھ ایسی حدیثیں بھی دیکھیے جن سے بالواسطہ بعض اعمال کے داخلِ عبادت ہونے کا پہلو نکلتا ہے۔

۱۰) مَن قبَل وَلَدَہٗ کتب اللّٰه لہٗ حسنة وَمَن فَرَحَہُ اللّٰه یَوم القیامة

(حدیثِ رسول: لآلی الاخبار:۲۳)

(۱۰) جو شخص اپنے بچے کو پیار کرے گا اللہ اس کے نام پر ایک نیکی درج فرمائے گا اور جو اسے خوش کرے گا اللہ اس کو قیامت کے دن خوش کردے گا۔

(۱۱) ایک شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کے پاس حاضر ہوا، اُس نے کہا:

مَا قبلتُ صَبِیاً قط (میں نے کبھی کسی بچے کو پیار ہی نہیں کیا)

جب وہ چلا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے ارشاد فرمایا: ھٰذا رَجُلٌ عِندی اِنَّہٗ مِن اَھلِ النّار (میرے نزدیک یہ شخص جہنمی ہے۔) (لآلی الاخبار: ۳۳)

۱۲) مَن سَقیٰ کبدالحرامن بھیمة او غیرھا اظلهُ اللّٰهُ فی ظلّ عرشهِ یوم لاضلَ الاظله۔

(۱۲) امام محمد باقر کا قول ہے کہ "جو شخص کسی جلتے جگر کو، خواہ وہ حیوان ہو یا غیر حیوان، سیراب کرے گا، تو اللہ اس کو عرش کے سایے میں اس دن جگہ دے گا جس دن اس کے سایے کے سوا اور کہیں سایہ نہ ہوگا۔

۱۳) اِنَّ لِاَنفُسِکُم عَلَیکُم حقاً فَصُومُوا وَافطروا قُومُوا وَ نَامُوا فَاِنّی اَصُومُ وَافطَرُ وَ اَقومُ وَاَنام و اکِلُ اللَّحمَ و الدھِن وَاٰتِی النساءَ فَمَن رَغِبَ عَن سُنَّتِی فَلَیسَ مِنّی۔ (حدیثِ رسولؐ)

(۱۳) تم پر تمھارے نفسوں کا بھی حق ہے۔ اس لیے روزے رکھو، افطار کرو، راتوں کو نماز

بھی پڑھو اور سو بھی لیا کرو۔ میں بھی روزے رکھتا ہوں، افطار کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور استراحت بھی کرتا ہوں۔ گوشت اور گھی بھی کھالیتا ہوں اور عورتوں سے ازدواجی تعلقات بھی رکھتا ہوں۔ اب جو شخص میری سنت سے منہ موڑے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔ (حدیث)

عبادات اور اعمال خیر کا یہ اسلامی تصور پوجا پاٹھ یا صبحہ گردانی کا نہیں، طواف و زیارت کا نہیں ہے، بلکہ ان کے علاوہ بہت کچھ اور ہے اور زور اسی "بہت کچھ اور" پر ہے۔ اسلام میں عبادت و ریاضت کا کوئی ایسا تصور بھی نہیں ہے، جو اس دنیا کو مایا جال قرار دیتا ہو اور اس کو تیاگ دینے اور ترک کرنے کی ترغیب دیتا ہو۔ اسلام کا پیغام حیات کو برتنے، دنیا کو نیکی کے ساتھ اختیار کرنے، برائیوں سے پرہیز کرنے اور معاشرے کو شر اور فساد سے بچانے کا ہے، جہاں ترک و گریز کا پہلو نکلتا بھی ہے وہاں مفاسد دنیا مراد ہیں۔ دنیا آخرت کی کھیتی یعنی نیک کام کرنے کا وسیلہ ہے۔ یہاں کی ہر چیز فانی ہے، اس سے اتنا ہی دل لگانا درست ہے جس سے صالح رزق مل سکے اور دوسروں کی بھلائی کے کام ہو سکیں۔ اگر دنیا نیکی اور خیر کی راہ روکنے لگے تو دنیا کا یہ مفسد اور خراب پہلو ترک کردینے کے قابل ہے نہ کہ خود دنیا۔

اسلام کو بےعملی اور آرام طلبی دونوں ہی سے اس لیے بیر ہے کہ اس سے فرد اور جماعت دونوں کی تباہی ہوتی ہے۔ دنیا کو برتنے کا جو پیغام دیا گیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں جو وسائل حیات و آرام مہیا ہیں، ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔ بےعملی، تساہل اور مجبوری کا سبب بنتی ہے۔ عمل سبھی کو کرنا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کچھ لوگ تو کام کریں اور کچھ لوگ دوسروں کے کام کا پھل کھائیں۔ آخرالذکر صورت میں دو برائیاں پیدا ہوتی ہیں، جن کو بے جدوجہد کے پھل مل جاتا ہے وہ غرور نمائش میں مبتلا ہوکر اور بھی بہت سی برائیوں کا سرچشمہ بنتے ہیں۔ مثلاً جبر و استبداد، اقتصادی استحصال وغیرہ۔ دوسرے یہ خود کام نہ کرنے کی وجہ سے وہ مسائل کو معروضی نقطۂ نگاہ سے دیکھ بھی

نہیں پاتے اور نئی نئی سماجی الجھنیں پیدا کرتے ہیں۔ اسلام کو غرور و نمائش سے جنگ ہے۔ کسی کام، حتیٰ کہ عبادت اور علم تک کی نمائش کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔ دنیا کی نعمتیں سبھی کے لیے ہیں اور حقیقت ہیں لیکن ان کے حصول کے لیے محنت اور جدوجہد لازمی ہے اور جب یہ حاصل ہو جائیں تو اس میں سے قرابت داروں، پڑوسیوں، ناداروں، یتیموں، قیدیوں اور غلاموں کو بھی ان کا حق دینا چاہیے۔ اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کا نام بھی توکل نہیں ہے۔

توکل

روس میں اس صدی کے آغاز میں مذہب کے خلاف جو آواز اٹھی اور اس کو جو افیون سے تشبیہ دی گئی تو اس کے قوی تاریخی اسباب تھے۔ اس آواز میں تخاطب عیسوی چرچ اور یہودی مذہبی تنظیم سے تھا۔ ان دنوں مذہبوں کے رہنماؤں نے مذہب کی بنیادی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا تھا اور عوام کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر اُن کو ظلم و استحصال کے جال میں بری طرح جکڑ لیا تھا۔ تاکہ وہ ان مذہب کے ٹھیکیداروں کے غلام اور دست نگر بنے رہیں اور آواز بلند نہ کریں۔ ان کا خاص حربہ یہ تھا کہ عوام کو توکل، قناعت اور تقدیر کے مسائل رکھ کر انھیں یہ باور کرایا جاتا تھا کہ ان کی یہ زبوں حالی قدرت کی طرف سے ہے۔ اسی طرح انھیں انفرادی اور جماعتی اعتبار سے گہری نیند سلا دیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اسلام کا نظام فکر بنیادی طور پر ایک اجتماعی اور عملی پروگرام کا حامل تھا۔ اس میں مادی اعتبار سے بھی بڑی لچک، عمومیت اور آفاقیت تھی۔ یہ نظام تدبیر اور فعالیت پر زور دیتا ہے۔ اگر انسانی بہتری اور معاشی برتری انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر مصروف عمل ہونے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے تو پھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے اور تقدیر کو کوسنے

سے کام نہیں چل سکتا تھا۔

اسلام میں بھی توکل کی بات آئی ہے اور قرآن کریم میں بار بار توکل کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن یہ عملی توکل بے جا امیدواری، سرمایہ داری، جاگیرداری، ذخیرہ اندوزی اور راہبانہ آمریت پر براہِ راست ضرب لگاتا ہے اور کسب حلال کے ذریعے اس طرح روزی کمانے کی ترغیب دیتا ہے کہ دوسروں کے حقوق پر ضرب نہ پڑے اور خواہ مخواہ بے کاروں کا ایسا طبقہ نہ ابھرے جو دوسرے کی بیگار پر زندگی گزارنا چاہتے ہوں۔ قرآن میں 'توکل' کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو کارسازِ حقیقی سمجھنا چاہیے اور جب ارادہ کرلے اور عواقب پر غور و خوض کر کے اور باہمی مشورے سے اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ یہ کام کرنا ضروری ہے تو پھر بے جھجکے ہوئے اسی کی کارسازی پر بھروسا کر کے بڑھتے رہنا چاہیے۔

۱) وَ قَالَ مُوسٰی یٰقَوۡمِ اِنۡ كُنۡتُمۡ اٰمَنۡتُمۡ بِاللّٰهِ فَعَلَیۡهِ تَوَكَّلُوۡۤا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّسۡلِمِیۡنَ ۝ (یونس:۱۱:۸۴)

۱) [حضرت موسیٰ نے کہا کہ اے میری قوم والو! اگر تم ایمان لائے ہو اور اللہ کے فرماں بردار ہو تو اس پر توکل (پورا بھروسا) کرو۔]

۲) وَشَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ ۚ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِیۡنَ ۝ (ال عمران:۱۵۹)

۲) [ان سے کاموں میں مشورہ لو مگر جب کسی کام کو ٹھان لو (کیوں کہ) جو لوگ خدا پر بھروسا کرتے ہیں انھیں اللہ ضرور دوست رکھتا ہے۔

۳) فَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَمَتَاعُ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ۚ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی

لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ٥ وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْاهُم یَغْفِرُوْنَ ٥ (الشوریٰ:۳۷-۳۶)

۳) تم کو جو کچھ مال و متاع دیا گیا ہے اور جو دنیاوی زندگی کا سامان ہے اس کے مقابلے میں جو کچھ خدا کے یہاں ہے وہ کہیں بہتر اور پائدار ہے۔ (اور) یہ خاص ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان دار ہیں اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں اور اگر غصہ آجاتا ہے تو معاف کردیتے ہیں۔

'توکل' کا اظہار دوستوں اور مسلمانوں کے مقابلے میں ہی نہیں، بلکہ دشمنوں اور کافروں کے مقابلے میں کرنے کو کہا گیا ہے۔

٤) وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ ۔ اِنَّهٗ هُوَالسَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ٥ (الانفال:٦١)

۴) [اور اگر (دشمن) خواہش صلح کریں تو تم بھی صلح کرلو اور اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھو، (کیونکہ) وہ بہت سننے اور جاننے والا ہے۔]

اس طرح اسلامی توکل ایک مثبت عمل ہے، منفی نہیں۔ اسلامی اعمال کی یہی نوعیت ہے جو انھیں عبادات کی صف میں پہنچادیتی ہیں۔

'توکل' کے سلسلے میں سرور کائنات کے بعض اہم ارشادات سے یہ گوشہ نکلتا ہے کہ جوع الارض کا رجحان دنیا میں بہت سی برائیوں کا پیش خیمہ رہا ہے۔ اس لیے شہوانی جذبات کے بے جا غلبے کو روکنا چاہیے۔ دوسری طرف اس کاہلی اور تساہلی سے بچنا چاہیے جو بے جا توکل سے وجود میں آتی ہے۔ یہ ہیں وہ احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ :

١) اَنِّی لَاَبْغَضُ الرَّجُلَ فَاعِز افاه اِلٰی رَبِّهِ یَقُوْلُ اَرزِقْنی وَیَتْرُکُ الطلب ٥

۱) میں اس شخص سے دشمنی رکھتا ہوں جو منہ کھولے پروردگار سے کہتا رہتا ہے کہ مجھے رزق عطا کر اور خود روزی نہیں کماتا ہے۔

٢) لان المومن اذالم یکن لهٗ حِرفة فلیعیش بِدِیْنِهٖ (بحارالانوار:٦)

۲) جب مومن صاحب حرفہ اور پیشہ ور نہیں ہوتا تو وہ اپنے دین کو ذریعہ معاش بنالیتا ہے۔

٣) اَلْعِلم بِاَنَّ المَخْلُوق لا یضرّهٗ ولا ینفع وَلایعطی وَلا یمنع و استعمال الباس من الخلق فاذاکان العبد کذالکَ لَم یعتمد الیٰ احد سوی اللّٰه ولم یطیع فی سِوی اللّٰه فهذا هو التوکل

(حدیث رسول اللہ: الآلی الاخبار:۱۵۶)

۳) توکل یہ جان لینا یہ کہ کوئی فرد مخلوق نہ ضرر پہنچا سکتی ہے اور نہ نفع دے سکتی ہے۔ عطا کرنا اور روکنا کچھ بھی اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اور دوسروں کی جانب سے امید قطع کرلینا۔ جب بندہ ایسا کرے گا تو اس کو اللہ کے سوا کسی اور پر بھروسا نہ ہوگا اور نہ وہ کسی دوسری طرف اطاعت کے لیے رجوع کرے گا اور یہی توکل ہے۔

ظاہر ہے اس میں اور رہبانوی توکل یا اس توکل میں جسے بے عملی کا بہانہ بنایا گیا ہو زمین آسمان کا فرق ہے۔ عمل ہی دین داری اور ایمان کی پہچان ہے۔ علم ہو عمل نہ ہو، نظریے پر فکری طور سے تصدیق کا رجحان بھی ہو لیکن یہ علم یہ نظریہ سب بے سود ہے، اگر اس پر عمل نہ ہو۔ جب عمل ہی محک و معیار ٹھہرا تو مال و دولت، جاہ و حشم، عہدہ و رتبہ سب ثانوی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ یہ بھی ایک اہم ترقی پسندانہ نکتہ تھا جو اسلام نے ابھارا۔

مال نہیں اعمال

اعمال پر زور دینے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سب سے پہلے اس نظریے پر وار کیا جائے کہ مال انسان کا سرمایۂ افتخار ہے اور مال دار انسان کی بے عملی اس کا حق ہے۔ عرب میں یہ نظریہ مسلمات کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور اسے بے چون و چرا تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ ارباب مال وزر کے ہاتھوں میں اقتدار تھا، تجارت اور زمینیں تھیں۔ سود وغیرہ کا کاروبار کر کے وہ کسانوں اور دستکاروں کو بھی اپنا دست نگر بنا چکے تھے اور طاقت حاصل کر کے استحصال پر اُتر آئے تھے۔ عام لوگ بھی یہی سمجھنے لگے تھے کہ وہی بزرگ اور قابل عزت ہیں۔ قرآن کریم میں قصوں کے ذریعے یہ سچائی واضح کی گئی کہ تقریباً ہر دور میں مصلحوں اور پیغمبروں کو اسی سرمایہ پرستانہ رجحان کا مقابلہ کرنا پڑا اور اب سرزمین حجاز میں بھی جہالت اور فخر بیجا میں گھرا ہوا معاشرہ یہ قبول کرنے کو تیار نہیں تھا کہ عرب کے صحراؤں میں گلہ بانی کرنے والا انھیں جیسا انسان، رسول اور رہبر بھی ہو سکتا ہے۔

یہ معاملہ دوسرے انبیا کے ساتھ بھی پیش آچکا تھا۔ حضرت نوحؑ سے ان کی قوم نے کہا تھا کہ تمھارے پیرو تو رذیل اور پست طبقے کے لوگ ہیں، پھر ہم تم پر کیسے ایمان لائیں؟ قَالُوا اَنُؤمِنُ لَکَ وَاتَّبَعَکَ الْاَرْذَلُون ط ان کے سرداروں نے یہ بھی کہا:

مَا نَرَاكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ج وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ o (ھود:۲۷)

(ہم تو تمھیں اپنا ہی سا ایک آدمی پاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمھارے پیرو ہوئے بھی ہیں تو ہمارے چند رذیل لوگ اور وہ بھی بے سوچے سمجھے اور ہمیں تو تم میں ایسی کوئی بڑائی نظر نہیں آتی جس میں تمھیں ہم پر فوقیت حاصل ہو بلکہ ہمارا تو یہ گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔)

دوسرے انبیا کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ o وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ o (سبا:۳۴-۳۵)

[ہم نے جس بستی میں بھی کوئی ڈرانے والے (پیغمبر) کو بھیجا تو وہاں کے بڑے خوش حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم تو ان احکام کے کبھی ماننے والے نہیں جنھیں دے کر تمھیں بھیجا گیا ہے اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم تو مال اور اولاد میں تم سے زیادہ ہیں اور ہم مبتلائے عذاب ہونے والے نہیں۔]

جناب نوحؑ نے جب اپنی قوم سے الٰہی پیام کے قبول کرنے کی بات کی اور ان کو سمجھایا کہ مجھے مال و دولت کی ہوس نہیں۔ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، اجر دینے والا تو اللہ ہے تو ان کی قوم والوں نے وہی رٹ لگائی:

اَنُؤمِنُ لَکَ وَاتَّبَعَکَ الْاَرْذَلُون ط

(جب رذیلوں ہی کو تمھاری پیروی کرنا ہے تو ہم تم پر ایمان کیا لائیں؟) مقصد یہ تھا کہ ان مفلس غریب اور مزدور پیشہ مومنوں کو اپنے پاس سے ہٹا دو تو ہم ایمان لائیں گے۔ لیکن حضرت نوحؑ نے پورے استقلال اور طمانیت قلب کے ساتھ جواب دیا:

وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ط [ھود:۱۲:۲۹]

(میں تو مومنوں کو اپنے پاس سے ہٹانے والا نہیں۔)

فرعون نے یہ تصور کیا تھا کہ جو رسول آئے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سونے کے کنگن پہنے ہو اور اس کے ساتھ ساتھ فرشتے ہوں۔ جب موسیٰؑ فرعون کے پاس آئے:

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ج اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ٥ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۥ وَّ لَایَکَادُ یُبِیْنُ ٥ فَلَوْ لَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْجَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِکَةُ مُقْتَرِنِیْنَ ٥ (الزخرف:۵۳۔۵۱)

(پھر فرعون نے اپنی قوم کو پکارا اور کہا کہ اے قوم! کیا ملک مصر میرا نہیں اور کیا یہ نہریں جو (ہمارے محل کے) نیچے بہہ رہی ہیں (ہماری نہیں)؟ کیا تمھیں اتنا بھی نہیں سوجھتا کہ میں اس شخص (موسیٰ) سے جو ایک معمولی آدمی ہے، بہتر ہوں۔ یہ تو صاف گفتگو بھی نہیں کرسکتا، اگر یہ بہتر ہے تو اس کے لیے سونے کے کنگن کیوں نہ اُتارے گئے اور اس کے ساتھ فرشتے جمع ہو کر کیوں نہ آئے؟) [الزخرف:۵۳۔۵۱]

اب جزیرہ نمائے عرب میں انبیا کی یہی تاریخ اپنے آپ کو پھر دہرا رہی تھی۔ مکہ میں بھی یہی صدا بلند کی گئی:

لَوْ لَانُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ ٥ (الزخرف:۳۱)

(آخر یہ قرآن دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل ہوا؟)

[الزخرف:۳۱]

لیکن قرآن اور دوسرے صحیفوں کی نظر میں پیغمبری اور مال داری لازم وملزوم کب تھے؟

اسلامی نظامِ فکر میں ایک جھلک عام قاری کے لیے پیش کی گئی ہے۔ اس کے فلسفیانہ اور نظریاتی پہلوؤں سے دراصل اسی سطح پر گفتگو کی گئی ہے۔ اب ہم ان عملی پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو زیادہ اہم ہیں؟ جو انھیں افکار سے متاثر ہیں اور جنھوں نے ان کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ ان افکار وخیالات نے ایک سمت کا تعین کر دیا تھا اور پورا معاشرہ اسی سمت چل پڑا، آہستہ آہستہ، مخالفتوں کو جھیلتا ہوا خارزاروں کو صاف کرتا ہوا، تاکہ ایک نیا باغ لہلہا اُٹھے۔ یہ کارواں مکہ سے چلا اور مدینہ پہنچتے پہنچتے اس کی وسعت اندازہ

سے کہیں زیادہ ہوگئی۔ مخالفتیں مکہ میں بھی ہوتی تھیں، لیکن مدینہ میں تو باقاعدہ جنگیں ہوئیں، متواتر، یکے بعد دیگرے۔ یہ قافلہ بے سروساماں تھا، سامانِ حرب نہیں، سپاہی بھی کم تھے، لیکن سالارِ قافلہ دُور بیں اور باہمت تھا اور اس کے ساتھیوں کے سینوں میں بھی دِل قوی تھے۔ مدینہ کی آبادی مکہ والوں کے لیے اجنبی تھی، لیکن ان مہاجرین کے لیے اہلِ مدینہ انصار بن گئے، اخوت میں بندھ گئے۔ اسلام نے قبیلوں کی تفریق بڑی حد تک مٹادی تھی۔ دور دراز کے قبیلے بھی بھائیوں کی طرح شیر وشکر ہوجاتے تھے۔ یہ ایک طرح کی سیاسی دوستی تھی اور نظریاتی یگانگت، لیکن وہ اقدامات جو بہت بڑی تبدیلیاں لائے ان کا اثر گھر کی زندگی پر، ہر فردِ بشر پر پڑا۔ اس لیے ان پر الگ سے گفتگو ضروری ہے۔

اسلام کا بنیادی مقصد عرب کی بدویانہ اور خانہ بدوش زندگی کی معیشت اور تصورات سے نکال کر ایک بہتر اور صالح تر تمدن کی طرف لے جانا اور اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے، غیر منظم اور جنگجو قبائل کو ایک نئے رشتے میں پرونا تھا:

''تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو'' اس سلسلے میں قرآن کریم نے عرب ذہنوں کو اس زمانے کی طرف یاددہانی کے ذریعے موڑا ہے جب وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے اور اللہ کے احسان کو یاد دلایا ہے جب اس نے دشمنی کی جگہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی تھی۔ یہ لوگ اس کے فضل سے بھائی ہوگئے تھے۔ یہ گویا دہکتی آگ کی بھٹی کے دہانے پر کھڑے تھے اور گرا ہی چاہتے تھے مگر اللہ نے بچالیا۔ اس زمانے میں ان خانہ بدوش جنگجوؤں کے پاس قبائلی رواج ورسوم کے سوا کوئی قانون نہ تھا، اور زیادہ تر رسوم ورواج دورِ بربریت کی یادگار تھے۔ یہودی اور عیسائی بھی توریت اور انجیل کو بھلا بیٹھے تھے یا اصلی تعلیمات کی من مانی توجیہات کر کے اصل مقصد کو مسخ کر چکے تھے۔ اب قرآن اور فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے ذریعے ایک نئے قانون کی تدوین ہو رہی تھی۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ، اہلِ بیت اور مقرب

صحابی بھی انھیں قوانین پر عمل پیرا ہو کر عوام کو یہ دِکھا رہے تھے کہ یہ قوانین و ہدایات قابل عمل ہیں۔ ان قوانین میں کافی اہم وہ قوانین بھی تھے جن کا تعلق غلاموں اور عورتوں سے تھا اور اس دور میں یہ خاصے انقلابی اعلانات و ہدایات تھے کیوں کہ یہ دونوں طبقے عرب سماج میں مدتوں سے ظلم کا نشانہ تھے اور چونکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی ان کے ساتھ اسی طرح کے ظلم روا رکھے جا رہے تھے، اس لیے ان سے ہمدردی کرنے والا اور ان کی فلاح و بہبود کی تدبیریں سوچنے والا کہیں اور نہیں تھا۔

آغازِ بیداری

اس نئی بیداری کی شعاعیں غارِ حرا سے پھوٹیں۔ نئی صبح نے سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا، جو لوگ غیظ و غضب میں نیلے پیلے ہو رہے تھے اور جنھوں نے دشمنی پر کمریں کسنا شروع کر دی تھیں وہ سمجھتے تھے کہ اس نئی فعالیت اور تحریک کو وہ چٹکیوں میں مسل سکیں گے لیکن بقول عزیز لکھنوی:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن   پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

دور افتادہ ریگستانوں اور غیر آباد پہاڑیوں کے تاریک گوشوں میں بھی نئے چراغ جل اُٹھے تھے۔ ایک نئی آواز کو سن کر کان کھڑے ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ بڑے غور و خوض سے سن رہے تھے جیسے یہ بھی ان کے دل کی آواز ہو۔ جو کچھ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کہہ رہے تھے، وہی قرینِ عقل تھا، قرینِ انصاف تھا۔ اب تک سردارانِ قبیلہ جو کچھ کہتے اور کرتے تھے وہ سراسر ظلم تھا۔ یہ آواز جلد ہی دور دور تک پھیل گئی۔ اسے کون روک سکتا تھا۔ مکہ تمام کاروانوں اور قبیلوں کی گزرگاہ تھا۔ یہاں کی خاموش اور جامد فضا کی ہر حرکت دور دور تک محسوس کی جاتی تھی۔ ایران میں سلمانؓ، حبش میں بلالؓ کی وساطت سے اور قبیلۂ

غفار میں ابوذرؓ کے ذریعے اس پیغام کی روحانی اور معاشی کشش محسوس کی جانے لگی۔

غفار وہ قبیلہ تھا جس سے گرد و نواح کے وہ تمام کارواں ڈرتے تھے جنھیں اُدھر سے گزرنا ہوتا تھا۔ یہ لوگ نہ معلوم کب حملہ کر دیں اور لوٹ لیں۔ وہاں ایک معمولی غفاری جندب بن جنادہ نے اس نئے پیغام اور اس کے پیغامبر کے بارے میں سنا اور اس کے یہاں مزید معلومات حاصل کرنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ پہلے اپنے بھائی انیس کو مکہ بھیجا، لیکن انھوں نے یہاں نفرت اور استہزا کے علاوہ اس پیغامبر بزرگ کے بارے میں کچھ اور نہ سنا۔ آخر ایک روز اس پیغمبر حق کو کچھ لوگوں میں گھرا ہوا دیکھا۔ اس کی عمیق اور شیریں باتیں سنیں پھر لوگوں کو اس کی طرف ہجوم کرتے اور شور و غوغا مچاتے دیکھا، اس کے مقابلے میں اس کا سکون و وقار دیکھا اور گرویدہ ہو گیا، لیکن جندب (جو بعد میں ابوذر کے نام سے مشہور ہوئے) کے لیے اس پیغام کا کوئی حصہ انیس کا بدوی ذہن محفوظ نہ کر سکا۔

اب ابوذر خود مکہ میں تفتیشِ حال کے لیے اس طرح روانہ ہوئے کہ صرف ایک بوسیدہ سی مشک کاندھے پر تھی جس میں پانی بھر لیا تھا۔ پھر مکہ میں آئے، کعبہ تک پہنچے جہاں ان کے قبیلے کا بت مِنات نصب تھا، لیکن ادھر رُخ نہیں کیا۔ رات ہوئی تو وہیں صحن میں سو رہے۔ ان کو ایک دن مسافرانہ حالت میں دیکھ کر حضرت علیؑ پاس آئے اور دریافت حال کیا۔ یہ سن کر کہ مسافر ہیں اپنے ساتھ گھر لائے، لیکن ایک دوسرے کے بارے میں نہ کچھ پوچھا گیا نہ بتایا گیا۔ پیاپے تین دن یوں ہی گزر جانے کے بعد حضرت علی نے نہایت شفقت سے ایک خاموش اور تنہا شب ابوذر سے مکہ آنے کی غرض پوچھی۔ ابوذر نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کی زیارت کا شوق ظاہر کیا۔ یہ ایمان کی کشش ہی تھی کہ ابوذر کو بے اختیارانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے گھر کھینچ لائی تھی لیکن ان دنوں حضورِ انور کا قیام کوہِ صفا پر ارقم کے گھر تھا کیوں کہ باہر کی فضا خشم آلود اور مکدر ہو چکی

تھی۔ حضرت علی نے دوسری رات کو حضور سے ملاقات کرانے کا وعدہ کیا اور بڑی رازداری سے وہاں لے گئے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ نے ان کے ذوق وشوق کا حال سنا اور انھیں ان کی خواہش کے مطابق اسلام کے حلقے میں داخل کرلیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد یہ پہلے مسلمان تھے اور ان کے دائرۂ اسلام میں آجانے سے مسلمانوں کی تعداد پانچ تک پہنچ گئی تھی۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ نے انھیں ہدایت کی کہ وہ اپنے قبیلے کو واپس جائیں اور مکہ والوں پر اپنے مسلمان ہونے کا حال پوشیدہ رکھیں کیونکہ اس سے ان کو گزند پہنچنے کا اندیشہ تھا، لیکن ابوذر معمولی دل و دماغ کے انسان نہیں تھے کہ ڈر جاتے۔ ابوذر نے ظاہر کردیا کہ وہ تو ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کریں گے اور پھر وہ کعبہ پہنچے۔ وہاں قریش کو مجتمع پایا تو بے خودی میں قلندرانہ نعرہ بلند کیا: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ یہ سننا تھا کہ قریش ان پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور بے تحاشا مارنے لگے۔ اتفاقاً رسول اللہ کے چچا حضرت عباسؓ کا اُدھر سے گزر ہوا تو وہ بیچ میں حائل ہوگئے اور تنبیہ کی کہ ''تم نہیں جانتے کہ قبیلہ غفار کے ہیں۔ یہ قبیلہ تمھاری تجارتی گزرگاہ پر واقع ہے۔'' قریش اپنا مالی نفع ونقصان خوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے چھوڑ دیا۔ اس طرح ابوذر کی جان بچی۔ دوسرے دن ابوذر نے پھر اسی غفاری جرأت کا ثبوت دیا اور قریش کی بدوی بیدادی کا نشانہ بنے۔ حسنِ اتفاق سے پھر حضرت عباسؓ نے ہی قریش کو روکا۔ اس بار اس بُری طرح زدوکوب کیا گیا تھا کہ ابوذر مشکل سے اُٹھے اور اپنے کو زم زم تک پہنچایا اور اس کے شیریں پانی سے سیراب ہوئے۔ تیسرے روز ابوذر پھر اسی دلیری پر آمادہ تھے۔ بالآخر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ نے آپ کو مکہ سے باہر جانے اور قبیلہ غفار میں اسلام کی تبلیغ پر مامور کیا۔ یہ دعوت وتبلیغ اتنی کارگر ہوئی کہ ابوذر کا پورا خاندان ہی نہیں بلکہ سارا قبیلہ مسلمان ہوگیا۔ راہزنی ترک کردی اور خیروصلاح کی راہ اپنالی۔ [1]

[1] دو شہید: احسان خراسانی (کتب خانہ ملی، تہران)

مسلمان ہوجانا قریش کے نزدیک ناقابلِ معافی گناہ مانا جارہا تھا، لیکن یہ کمزوروں اور ضعیفوں کے دلوں میں گھر بھی کرتا جارہا تھا۔ سب سے پہلے بافہم عورتوں، امیر گھرانوں کی کنیزوں اور غلاموں نے اس آواز پر لبیک کہی۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنے غلام زید کو آزاد کرکے یہ دکھادیا تھا کہ غلام اور کنیزیں بھی اپنی آزادی حاصل کرسکتی تھیں۔ زید کے بعد غلاموں میں سب سے پہلے بلال نے پیش قدمی کی اور اسلام کے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے حلقے میں آگئے۔ بلال امیہ بن خلف جمحی کے خاندان کے غلام تھے اور یہ خاندان مکہ کے تونگروں میں گنا جاتا تھا۔ جب ان کے مالک نے بلال کے مسلمان ہونے کا حال سنا تو وہ انھیں شہر کے باہر ایک بیابان میں لے گیا۔ وہاں بلال کے جسم سے کپڑے اُتار کر جلتی ریت پر لٹادیا اور چار کھونٹیوں سے باندھ دیا اور کہا کہ یا تو اسلام سے ہاتھ دھوؤ ورنہ اسی حال میں پڑے پڑے ہلاک ہوجاؤ۔ بلالؓ مرنے پر تیار ہوگئے۔ حضرت ابوبکرؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے بلالؓ کو ان کے مالک سے خرید کر اس صعوبت سے چھٹکارا دلایا۔

اب بلالؓ بھی تبلیغ اسلام کرنے لگے، جلد ہی اسلامی حلقے میں دو اور کنیزیں آگئیں۔ یہ حضرت عمرؓ کی کنیزیں تھیں۔ اس وقت تک خود حضرت عمر مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ کنیزوں کی اس جرأت پر کہ انھوں نے پیغامِ محمد پر لبیک کہی تھی، انھیں غصہ آگیا اور ان کو دینِ اسلام چھوڑنے پر مجبور کرنے لگے۔ جب انھوں نے انکار کیا تو اس قدر کوڑے مارے کہ دونوں کنیزیں لہولہان ہوگئیں۔ حضرت ابوبکرؓ کو خبر ہوئی تو انھوں نے دونوں کنیزوں کو خرید کر حضرت عمرؓ کے غضب سے ان کو رہائی دلائی۔

اس کے بعد ایک زنِ بادیہ نشین، 'غزیہ' نام، مسلمانوں کے حلقے میں داخل ہوئی۔ وہ کوئی کنیز نہ تھی اور بدوی مردوں کی طرح یہ بدوی عورت بھی ڈرنا نہیں جانتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ مسلمان ہوئی بلکہ بے خوفی سے تبلیغ اسلام بھی کرنے لگی اور جماعتِ قریش

اس کا کچھ بگاڑ نہ پائی۔ آخر انھوں نے یہ تدبیر کی کہ اسے بھی مکہ کے باہر جانے والے ایک کارواں میں لے گئے، ایک اونٹ پر بٹھا دیا اور رسی سے باندھ کر اونٹ والوں کے سپرد کر کے کہا کہ مکہ سے نکلنے کے بعد اسے کھانا پینا دینا بند کر دیں۔ جب بھوک پیاس سے مر جائے تو رسی کھول کر اس کی لاش صحرا میں پھینک دیں۔ تین دن اسی حال میں گزرے، چوتھی رات کو اس کے ہونٹوں نے تری محسوس کی اور اس نے اتنا پانی پیا کہ اس کی پیاس بجھ گئی۔ دوسرے دن صبح کو جب یہ قلب ماہیت دیکھی تو اونٹ والے بھی مسلمان ہو گئے اور اس عورت کو بھی رہا کر دیا۔

ابوجہل کی ایک کنیز سمیّہ تھی۔ یہ دایہ کے کام میں بھی مدد کر دیتی تھی۔ ابوجہل کو معلوم ہوا کہ سمیّہ نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے اتنے تازیانے مارے کہ وہ بے چاری بے حال ہو گئی۔ حضرت ابوبکر کو معلوم ہوا تو وہ اس کی بھی خریداری کے لیے گئے، لیکن ابوجہل بیچنے پر راضی نہ ہوا۔ جن قریش عورتوں کی وضع حمل کے وقت سمیّہ نے مدد کی تھی انھوں نے سنا تو وہ بھی ابوجہل کے پاس اس کی جان کی امان مانگنے لگیں لیکن ابوجہل تازیانے مارتا ہی گیا اور سر سے پانو تک سمیّہ کو مجروح کر ڈالا۔ پھر اسے خانۂ کعبہ لے گیا۔ وہاں قریش بڑی تعداد میں جمع تھے۔ ابوجہل نے وہاں سب کے سامنے سمیّہ سے کہا کہ دینِ محمد سے دست بردار ہو جائے۔ وہ بھی ہمت کی دھنی تھی اس نے انکار کر دیا۔ اس پر ابوجہل نے بھرے مجمع میں اسے قتل کر دیا۔

غلام، کنیزیں، اجنبی یا سیاہ پوست قریش کی بربریت کا نشانہ بنتے رہے لیکن یہ پیغام کی بنیادی سچائی تھی جو ہر طبقے کو اس ترقی پسندانہ اور انسانیت دوست آواز کا گرویدہ بنا رہی تھی۔ جب تک قریش یہ سمجھتے تھے کہ اکا دُکا کمزور اور نادار افراد ہی اس حلقے میں شامل ہو رہے ہیں تو قریش افراد کو ستانے اور اپنے خیال خام میں "راہِ راست" پر لانے میں لگے رہے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ نئے پیغام سے وابستہ حلقہ بڑھتا ہی جا رہا

ہے اور پورے پورے قبائل مثلاً غفار حلقے میں داخل ہونے لگے ہیں اور اکا دُکا مالدار بھی کھنچ آئے ہیں تو ان میں انتقام کی آگ اور زیادہ شدت سے بھڑک اُٹھی اور انھوں نے قصد کیا کہ کسی نہ کسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کو ہی راستے سے ہٹا دیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمانوں کو دوسری بار ہجرت کرنا پڑی۔ ہجرتِ حبشہ جزوی تھی اور ہجرتِ مدینہ مکمل تھی۔ اس بار حجاز کے تمام قبیلوں نے مل کر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ شبِ ہجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کو قتل کر دیں گے۔ آپ کے جیتے جی ترقی، امن اور مساوات کی یہ بڑھتی ہوئی رَو روکی نہیں جا سکتی تھی، لیکن ان کی یہ سازش ناکام رہی۔

قریش کے لیے اب یہ ممکن نہ تھا کہ وہ افراد کو ڈرا دھمکا کر اپنا مقصد حاصل کر سکیں۔ اسلام نے اپنے پیرووں کو سکھا دیا تھا کہ خدا کے علاوہ کسی سے نہ ڈریں۔ یہ بات عیاں ہوتی جا رہی تھی کہ محنت کش اور غلام، دبی کچلی عورتیں اور کنیزیں سب کے سب اس نئے پرچم کے تلے اکٹھا ہونے کو بے تاب تھے۔ دینِ ابراہیم کے بعض پیرووں نے بھی روشنی دیکھ لی تھی۔ اب ان میں سے کسی کا ضمیر اندھیرے سے صلح کرنے کو تیار نہ تھا۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ نے، جن کا فقر ان کی نگاہوں میں فخر کے قابل تھا، اپنے سیدھے سادے پُرخلوص مگر دور رس پیغام سے عرب کی تاریخ کا رُخ تو موڑ ہی دیا تھا۔ دنیا بہت جلد وہ منظر بھی دیکھنے والی تھی کہ مال و دولت و شاہی کے بت سرنگوں ہو ہو کر گرنے والے تھے اور عرب ہی نہیں، انسانیت کی تاریخ کا رُخ ہمیشہ کے لیے مڑ جانے والا تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ جس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کے مالدار نہ ہونے پر عربوں نے آپ کی رسالت قبول کرنے سے انکار کیا تھا، اب اسی رسول کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھ کر اہلِ اقتدار کا ایک بڑا اور ذی اثر طبقہ اس کے پیغام اور اس کے مضمرات سے خائف تھا اور اس کے وجود ہی کو مٹانے پر تُل گیا تھا۔ آخری حربہ قتل ہی تھا۔ لیکن اس کے

پہلے قریش نے ایک اور قدم اٹھایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے لیے لبھانے والے تحفوں کا پیغام لے کر گئے۔ خوبصورت عورتیں، مالِ دنیا، حکومت قبائل۔ کیا چاہیے؟ لیکن انھوں نے ان سب کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ ''اگر میرے ایک ہاتھ میں آفتاب اور دوسرے میں مہتاب رکھ دو گے تب بھی میں سچی بات کہنے سے باز نہیں آؤں گا۔'' کیا استغنا ہے، عقیدے اور ایمان کی کیا پختگی ہے اور عشقِ الٰہی میں کیا استقامت ہے!

اس محکم ایمان کے سامنے قریش کا لرزاں عقیدہ، ان کی گھبراہٹ اور بزدلی، کیا وقعت رکھتی تھی۔ انھوں نے صحیح طور پر محسوس کر لیا تھا کہ یہ پیغام، جو کمزوروں اور مظلوموں کی توجہ کا مرکز بنا جا رہا تھا قدیم نظام کی تباہی کا سبب بن کے رہے گا۔ یہ نظامِ کہنہ عقل اور انصاف پر مبنی نہیں تھا۔ اس کی بنیاد تو استحصال اور زور زبردستی پر تھی۔ کمزوروں کے خوف پر تھی۔ جب دل سے خوف نکل گیا تو ابوذر اور سمیہؓ ہی وجود میں آ سکتے تھے۔ عقیدوں کی اس پختگی کو ظلم اور جور کتنے دنوں تک روکے رکھ سکتے تھے۔ اگر ایک طرف قریش رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کے خون کے پیاسے تھے تو دوسری طرف ایسی بھی ہستیاں تھیں جو اُن پر جانیں قربان کر سکتی تھیں۔ شبِ ہجرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کے بستر پر علیؑ اس وقت بے خوفی سے سو رہے تھے۔ جب ننگی تلواریں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں۔

عروجِ نسواں

اس آغازِ بیداری کا نمایاں پہلو عورتوں کی حالت کی بہتری کی طرف متعدد اقدامات تھے۔ اس سے ہر ایک گھر متاثر ہوا اور پورے سماج نے نئی لہر کو محسوس کیا۔ دورِ جاہلیت کے عربوں کی نظر میں عورتوں کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ

کے زیادہ تر ہم عصر بچی کی پیدائش کو بدترین بے عزتی تصور کرتے تھے اور اس غریب کو زندہ دفن کر کے ہی اس بے عزتی کا ازالہ ہو سکتا تھا۔ ایک جاہل عرب شاعر کا یہ شعر اسی جذبے کی عکاسی کرتا ہے:

لِكُلّ اَب بِنت يرجى بقائها ثلاثة اصهار اذا ذكر الصهر

فبت يفيتها و بعل يصونها وقبر يوار بها و خيرهم القبر

[ہر بیٹی والا باپ جو چاہتا ہے کہ بچی زندہ رہے تو اس کو تین طرح کے دامادوں کی فکر شروع کر دینا چاہیے۔ ایک تو گھر، جس میں وہ اسے چھپا سکے، دوسرے شوہر جو اُس کی حفاظت کر سکے اور تیسرے قبر جس میں وہ دفن ہو سکے اور ان سب سے بہتر قبر ہی ہے۔]

عرب میں یہ ضرب المثل عام تھی کہ دَفنُ الْبنَـات مِن المُکَرّمَات (لڑکیوں کا دفن کر دینا عزت کی بات ہے) سردارانِ قبیلہ اور مالدار لوگ اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ انھوں نے سب سے زیادہ لڑکیاں مار ڈالی ہیں۔ قیس بن عاصم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے سامنے اقرار کیا کہ اس نے تیرہ بیٹیاں زندہ دفن کر دی ہیں تاکہ نعمان بن منذر کے اہل قبیلہ کے ہاتھوں اسیر ہونے سے بچ سکیں۔ یہ معتبر ترین شہادت موجود ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَاضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَكَظِيْمٌ o

(الزخرف:۱۷)

[اور ان میں سے جب کسی شخص کو اس چیز (بیٹی) کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غم وغصہ سے گھٹنے لگتا ہے۔]

اگر کسی کے اولادِ ذکور نہ ہوتی تو اسے مقطوع النسل (ابتر) کہا جاتا تھا۔ خود رسول اکرم کے یہاں جب تک بیٹا نہیں ہوا تھا انھیں بدبخت قریش اسی منحوس نام سے یاد کرتے

تھے۔قرآن پاک میں پورا سورۂ کوثر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نازل ہوا:

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ o فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ o اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَالۡاَبۡتَرُ o (الکوثر)
[اے رسول ہم نے تم کو کثرت سے اولاد عطا کی ہے۔تم اپنے پالنے والے کی نمازیں پڑھے جاؤ اور اس کو قربانی دیا کرو۔بے شک تمھارا دشمن ہی بے اولاد ہے۔)

باپ کو صرف یہی ایک خوف نہیں رہتا تھا کہ مخالفین یا حالات اسے ایسے قبیلے میں بیاہنے پر مجبور کردیں گے جو دوست نہ ہوں یا جو حیثیت میں کم تر ہوں۔بچیوں بلکہ بعض اوقات بڑی بچیوں کی جان لینے پر جو ناپاک خوف اُبھرتا تھا وہ یہ تھا کہ نئی آمد سے اخراجات کا بوجھ بہت بڑھ جائے گا۔اگر شوہر قبیلے کے باہر سے آتا تو مال واملاک کا ایک حصہ بھی اس کو مل جانے کا ڈر تھا۔قرآن کریم نے تقریباً یکساں الفاظ میں اس حرکت پر بار بار اظہار ناراضمندی کیا ہے:

وَلَاتَقۡتُلُوۡآ اَوۡلَادَکُمۡ خَشۡیَۃَ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُھُمۡ وَ اِیَّاکُمۡ ؕ اِنَّ قَتۡلَھُمۡ کَانَ خِطۡاً کَبِیۡرًا o (بنی اسرائیل:۳۱)
[اور اولاد کو مفلسی کے ڈر سے مار نہ ڈالو کیوں کہ انھیں بھی اور تمھیں بھی رزق دینے والے تو ہم ہیں اور اگر تم نے قتل کیا تو یہ گناہِ کبیرہ ہوگا۔

۲) وَلَاتَقۡتُلُوۡآ اَوۡلَادَکُمۡ مِنۡ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَ اِیَّاھُمۡ ؕ (الانعام:۱۵۲)
[اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالو کیوں کہ تم ہو یا وہ رزق دینے والے تو ہم ہیں]
ان بے گناہ بیٹیوں کی جان لینے کے سلسلے میں جاہلی طرزِ عمل عجیب وغریب

تھا۔وہی لوگ جو اِن کی جان لینے میں جھجکتے نہیں تھے،اگر کوئی ان بچیوں کی جان بچانے کے لیے انھیں خریدنا چاہتا تو یہ ان کو بیچنے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔اس کے تبادلے کا طریقہ نکالا گیا۔چنانچہ فرزدق شاعر کے دادا نے ایسے خونی باپوں سے ۲۸۰ بیٹیاں،ہر دختر کے عوض تین اونٹ دے کر حاصل کرلیں اور ان معصوموں کو زندہ درگور ہونے کے ہولناک عذاب سے بچالیا۔

قرآن کریم نے واضح لفظوں میں یہ آگاہی دی ہے کہ یہ وہ گناہ ہے جس کی قیامت کے روز سخت بازپُرس ہوگی اور جہنم کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ o بِاَیِّ ذَنۡبٍ قُتِلَتۡ o (التکویر:۸۔۹)
[اور جب زندہ درگور لڑکی کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اسے کس جرم میں قتل کیا گیا؟

عورتوں کی زبوں حالی کی بدترین شکل تو ان کا زندہ دفن کردیا جانا تھا،لیکن جو بچ جاتی تھیں ان کی حالت کچھ کم زبوں نہیں تھی۔وہ گھر کے اندر لونڈیوں کی طرح رہتی تھیں۔تمام سماجی اور اقتصادی حقوق سے محروم تھیں۔شادیاں بھی ان کی مرضی کے بغیر کردی جاتی تھیں۔کبھی کبھی تو پیدائش سے پہلے ہی بیاہ دی جاتی تھیں اور شادی بیاہ کے سلسلے میں بھی ایک نراج کی کیفیت تھی۔جن رسوم کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے ان میں بعض کا رواج صرف مقامی اور بعض کا مقامی اور بین علاقائی بھی تھا۔ایک رواج یہ بھی تھا کہ ایک عورت کے دس تک شوہر ہوسکتے تھے (نکاح الرہط) یا ماں اپنے شوہر کے مرنے پر اپنے سوتیلے بیٹے کی زوجہ ہوجایا کرتی تھی اور اسے 'نکاح المقت' کہتے تھے۔اگر بچہ کم سن ہوتا تھا تو شادی کرلینے کا حق خاندان کے دوسرے افراد کو مل جاتا تھا۔ایسے موقعوں پر ہونے والا شوہر بیوہ کی طرف کوئی کپڑا پھینکتا تھا یا اس کے سر پر چادر اڑھا دیتا تھا اور یہ دوسری شادی

کا اعلان تھا۔ اس کے علاوہ مہر سے بچنے کے لیے آپس میں بیٹیوں کا تبادلہ کرلیا کرتے تھے اور اس کو نکاح الشغر کا بلند بانگ نام دیتے تھے۔ اس کے برعکس 'نکاح الاستبضاع' میں لوگ اپنی بیویوں کو دوسروں کے حوالے کردیا کرتے تھے تاکہ جو اولاد پیدا ہو وہ زیادہ حسین اور عقیل ہو۔ یہ انتظام بالکل عارضی ہوتا تھا اور عورتیں اپنے نومولودوں کے ساتھ اپنے سابقہ شوہروں کے پاس واپس آجایا کرتی تھیں۔ اہل یمن میں یہ رواج جاری رہا کہ کئی بھائیوں کی مشترک بیوی ہوا کرتی تھی[1] اور دوسرے رسوم میں 'نکاح الخذن' تھا جس کے تحت لوگ دوسروں کی بیویوں سے دوستانہ جنسی تعلقات رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ 'نکاح الجمع' یعنی مشترک شادیاں اور 'نکاح البدل' یعنی تبادلے کی شادیاں بھی تھیں۔ جاہلی مدینہ میں عورت ایک سے زیادہ شوہر رکھ سکتی تھی۔ ثمودی کتبوں سے ان میں سے کئی بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔

جاہلیہ عورتوں کی آزادی بری طرح محصور و محدود کردی گئی تھی۔ طویل و شدید بین قبائلی جنگیں، سخت بے رحم جغرافیائی ماحول کے شدائد، روزمرہ کی زندگی کی صعوبتیں اور سب سے بڑھ کر موت یا زندہ دفن کردیے جانے کا خوف، برہنہ تلوار کی طرح ان کے سروں پر لٹکتا رہتا تھا اور ان کی حالت بے حد قابل رحم تھی۔ انھیں بس خاص خاص موقعوں مثلاً بازاروں وغیرہ میں اپنے مردوں کی معیت میں باہر جانے کا موقع ملتا تھا اور وہ بھی اکثر تفریحِ طبع کا سامان مہیا کرنے کی غرض سے۔ قبل اسلام، وہ فوجوں کے ساتھ کبھی کبھی زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے بھی جایا کرتی تھیں اور کبھی کبھی گا کر فوجیوں کا دل بھی بہلایا کرتی تھیں۔ ورنہ زندگی بالکل بے رنگ و نور تھی۔ ان کو شاید یہی ایک حق ملا تھا کہ کوئی ان کو اپنی بے زبان ملکیت بنا لے۔ یہاں بھی مالک چننے کا حق ان سے سلب کرلیا گیا تھا اور یہ حق باپ، بھائی یا دوسرے اعزا نے ہڑپ لیا تھا۔ باپ تو پیدائش سے پہلے ہی بیٹی کو کسی

[1] جاہلیت و اسلام: ۶۱۰

سے بیاہ دینے کا حق رکھتا تھا۔

اس منزل پر یہ بات اچھی طرح یاد رکھنے کی ہے کہ عورتوں کو جس طرح کی محرومیوں کا سابقہ تھا وہ جزیرہ نمائے عرب سے مخصوص نہیں تھیں۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں اس کی حالت کچھ بہتر نہیں تھی۔ بعض صورتوں میں تو یقیناً بدتر تھی۔ جب تک اسلام نے قوانین قرآنی پیش نہیں کیے تھے، عورتوں اور مردوں کے متوازی حقوق سامنے آئے ہی نہیں تھے۔ بلکہ یہ تصور ہی سب سے پہلے اسلام نے منظم طور پر دیا کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے بھی واضح حقوق ہیں۔ حضرت عمر بن خطابؓ کا بیان ہے کہ ہم کو مکہ میں یہ یقین تھا کہ عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مدینے میں ان کی حالت ذرا بہتر تھی۔ طلوع اسلام کے بعد جب عورتوں کے بارے میں آیاتِ الٰہی نازل ہوئے تو ہمیں اس طبقے کی اہمیت کا احساس ہوا۔[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی فعال اور متحرک قیادت کے ماتحت ایسے نئے طرز کے برتاؤ کی بنیاد پڑی جس سے عورت کی انفرادیت ابھرنے لگی۔ اب وہ خاندان اور سماج کی ایک باعزت فرد بنی۔

قرآن کریم نے صاف اور مدلل طریقے سے بتایا کہ عورت اور مرد قدرت کی نگاہوں میں ایک ہی تصویر کے دو ناقابل تقسیم رُخ ہیں:

۱) وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (الروم:۲۱)

۱) [اور یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے ہی نفسوں (ہم جنسوں) سے تمھارے لیے بیبیاں پیدا کیں تاکہ تمھیں ان سے تسکین ملے اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت کے جذبات قائم کیے۔ یقیناً غور کرنے والوں کے لیے ان میں

[1] صحیح بخاری: ۱: ۸۶۹

نشانیاں ہیں۔]

۲) يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ (النسآء:۱)

[اے لوگو! اپنے پالنے والے کا تقویٰ اختیار کرو (اس سے ڈرو)۔ میں نے تم سب کو ایک ہی نفس (جنس) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بھی پیدا کیا اور پھر ان سے بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلائے۔ اور تم اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی قطع الرحم سے ڈرو بے شک اللہ تمھارے اوپر نگراں ہے۔]

۳) فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۭ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ۭ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ (الشوریٰ:۱۱)

۳) [سارے آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا (وہی ہے) اسی نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے جوڑے بنائے اور چار پایوں کے جوڑے بھی اسی نے بنائے۔ اس میں تم کو پھیلاتا رہتا ہے۔ کوئی چیز اس کی مثل نہیں ہے اور وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔]

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (الاعراف:۱۸۹)

[وہ خدا ہی تو ہے جس نے تم کو ایک ہی نفس (جنس انسان) سے پیدا کیا اور اسی سے جوڑا بھی بنایا تا کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔ جب وہ اس (اپنی زوجہ) سے ہم بستر ہوا تو ہلکے

حمل سے ہوگئی اور اسے لیے چلتی پھرتی رہی جب حمل میں وزن آیا تو پالنے والے سے دعا کرنے لگے کہ اگر تو ہمیں صالح اولاد دے تو ہم تیرے شکر گزار رہوں گے۔]

پہلے تو یہ سامنے کی بات عربوں کو سمجھائی گئی کہ جنس کے اعتبار سے تم دونوں ایک ہو اور پیدا ہی اس لیے کیے گئے ہو کہ ایک دوسرے کی تسکین قلب کا سامان بنو۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان محبت اور رحمت فطرت نے عطا کی ۔ یہ جذبات اور احساسات بقائے نسلِ انسانی کے لیے ضروری ہیں اور امن و امان کی زندگی کے لیے بھی۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۚ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (البقرۃ:۲۲۳)

(تمھاری عورتیں گویا تمھاری کھیتیاں ہیں اور اپنی کھیتی میں مرضی کے مطابق آؤ جاؤ اور اپنی بھلائی کے لیے عمل کرتے رہو اور خدا سے ڈرتے رہو اور یہ یاد رکھو کہ تم کو ایک دن اس کے سامنے ضرور جانا ہے۔)

اللہ کی نگاہوں میں مرد اور عورت اپنے اپنے اعمال کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں اور صالح اعمال کی بنا پر جزا اور سزا کا فیصلہ ہوگا۔

۱) مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (النحل:۹۷)

[مرد ہو یا عورت جو بھی نیک کام کرے گا اور وہ ایمان دار بھی ہوگا تو ہم اسے دنیا میں بھی پاک زندگی بسر کرائیں گے اور آخرت میں بھی جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کا اچھے سے اچھا اجر عطا کریں گے۔] (النحل:۹۷)

۲) فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ج بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ج (آلِ عمران:۱۹۵)

[تو ان کی اللہ نے دعا قبول کر لی اور فرمایا کہ ہم تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو اکارت نہیں کرتے، وہ مرد ہو یا عورت۔ (اس میں کچھ کسی کی خصوصیت نہیں کیونکہ) تم ایک دوسرے کی جنس ہو۔]

۳) وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا o (النساء:۱۲۴)

[اور مردوں اور عورتوں سے جو بھی نیک عمل کرے گا بشرطیکہ وہ ایمان دار بھی ہو تو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔]

پھر اچھے سلوک کی ہدایت کرتے ہوئے ان سے کہا گیا:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (عورتیں تمھاری زینت و پوشش ہیں اور تم ان کی زینت و پوشش ہو۔) یہ زیب و زینت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب ان سے اچھا سلوک کیا جائے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ج فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا o (النساء:۱۹)

[اور بیبیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہو اور اگر کسی وجہ سے انھیں ناپسند کرو (تو بھی صبر کرو کیونکہ) عجب نہیں کہ جس کو تم ناپسند کرو خدا اس میں تمھارے لیے بہتری کر دے۔]

اسلام عرب میں قبیح رسموں کی بیخ کنی کے سلسلے میں عورتوں پر بیداد اور ظلم کے خاتمے کی طرف منظم طور پر متوجہ ہوا۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا ختم کیا جائے، نکاح اور شادی

کے سلسلے میں عورت کی بھی رائے لی جائے، پھر بے روک ٹوک تعدادِ ازدواج ختم کیا جائے۔ طلاق، مہر، خلع کے ایسے قوانین وضع ہوں جو عقل پر مبنی ہوں۔ عورت کو اپنی کمائی پر پورا پورا حق ہو، وراثت میں اس کا بھی حصہ مقرر ہو، وہ گھر کی حیثیت سے حکمراں ہو اور مرد اس کا رفیق کار، معاون اور روزی رساں ہو۔ وہ مشوروں میں شریک ہو۔ غرض اب اس کی حیثیت ایک آزاد اور فعال فرد کی حیثیت سے ابھرنے لگی اور یہ ترقی پسندانہ ہی نہیں، بلکہ اس دور میں انقلابی اقدامات تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے خوش اسلوبی سے سرانجام دیے۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ نے یہ واضح کر کے بتایا کہ مرد عورتوں کا کوئی آمرانہ سردار نہیں ہے، البتہ شادی کے رشتے کی بدولت اُسے کچھ خصوصی حقوق و فرائض حاصل ہوئے ہیں، لیکن وہ عورت کے حقوق میں اس وقت تک کوئی مداخلت نہیں کر سکتا جب تک وہ علانیہ کوئی گناہ نہ کرے۔ انھوں نے ان کی ذمہ داریاں تقسیم کر دی تھیں۔ مرد اپنے کاروبار کو سنبھالتا ہے اور عورت اپنے شوہر کی گھریلو ذمہ داریوں کی دیکھ بھال کرتی ہے اور اس کی ذمہ دار ہے۔ (سنن ابن ماجہ) اس کے علاوہ ان کی بہت سی مشترک ذمہ داریاں اور فرائض بھی تھے۔

اسلام نے شادی کے تمام غیر صحت مند اور غیر صالح طریقے ختم کر دیے اور اسلامی شادی ایک باہمی معاہدے کی شکل اختیار کر گئی، جسے روحانی اور مذہبی اہمیت بھی حاصل ہوئی۔ بے انتہا شہوت پسند اور جنسی بے راہ رویوں میں گرفتار، تعددِ ازدواج کی مختلف لعنتوں میں مبتلا سماج کو اسلام نے یہ حکم دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی چار سے زیادہ شادیاں نہ کرے۔ ان چاروں پر بھی حد بندی تھی کہ باہم مساوات برتنے کی پوری قدرت اور اقتصادی استحکام ہو۔ ویسے اسلام نے یہ اجازت بشکل مجبوری دی تھی اور کوئی اجازتِ عام نہ تھی۔ یہ بات ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ اسلام نے دراصل شادیوں کی

زیادتی پر روک لگائی تھی اور شادیوں کی تعداد جو سیکڑوں تک پہنچ جایا کرتی تھی اور جس کو سماج کی حمایت حاصل تھی، اسے اسلام نے یکسر روک دیا اور چار کی تعداد بھی عدل وانصاف کی شرط لگا کر مزید محدود کردی۔ تعدد ازدواج ساسانی، ایران، چین، یورپ اور ہندوستان ہر جگہ رائج تھا۔ رومن شہنشاہ والن ٹین نے اسے قانوناً جائز قرار دیا تھا۔ ایران میں بیویوں کی تعداد کا انحصار اقتصادی حالت پر تھا۔ صاحبانِ حیثیت کے حرم میں تعداد سیکڑوں تک پہنچ سکتی تھی۔ عربوں کے یہاں بھی کوئی حد نہ تھی۔ اسلام نے اس نراجی صورت کو ایک نظام کے سانچے میں ڈھالا اور ایک صحت مند شکل دی۔ اس زمانے میں جنگوں اور دیگر آفاتِ ارضی و سماوی کی وجہ سے عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوگئی تھی۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ اور حضرت علی نے اپنی زندگی کے بہترین ایام میں صرف ایک بیوی پر قناعت کی۔ آخر کی شادیاں درحقیقت سیاسی شادیاں تھیں جن کا مقصد متحارب قبائل کو رشتۂ مودّت میں منسلک کرنا تھا۔ اس وقت عرب سماج جس طرح کی تیرہ و تار غریبی میں لپٹا ہوا تھا، اس میں گھر کے اندر عورت اب بھی بہت سختی اور محنت کی زندگی بسر کررہی تھی۔ اس اندھیرے کو دور کرنے کی جدوجہد میں وہ اب اپنے شوہر کے دوش بدوش مشغول تھی، تاکہ سماجی زندگی روحانی اور مادی ہر اعتبار سے خوش گوار ہوسکے۔ مرد بھی ماضی کے مزعومات کو بھول کر اسے اپنا محبوب شریکِ کار سمجھنے لگے تھے۔ محبت کا دور شروع ہوچکا تھا۔ عورت کو اب اپنے حقوق کا احساس بھی ہوچلا تھا اور اگر کہیں اس میں کوتاہی ہوتی تو وہ رسالت کی عدالتِ عالیہ میں اس کے خلاف اپیل بھی کرسکتی تھی۔ اس سے بڑی ڈھارس اور تقویت تھی۔

آخری حج کے دوران ایک عرب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کسی طارق کی عہد شکنی کی شکایت کی۔ اس نے یہ عہد کیا تھا کہ اس کے جو پہلی بیٹی ہوگی اس کی شادی اس عرب سے کردے گا جو اسے ایک نیزہ خرید دے گا۔ اس

وقت عرب کو اس نیزے کی شدید ضرورت تھی، اس نے نیزہ خرید دیا۔ اس کے کئی برس بعد اسے معلوم ہوا کہ طارق کے یہاں بچی پیدا ہوئی ہے اور اب بڑی ہوچکی ہے۔ عرب نے شادی کا مطالبہ کیا تو طارق نے مزید مہر طلب کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نہایت خاموشی سے سنتے رہے اور پھر فرمایا: ''حق نہ تو تمھاری طرف ہے اور نہ طارق کی طرف، بہتر یہ ہے کہ تم لوگ اس معاملے کو لڑکی کے منشا پر چھوڑ دو اور اپنی اپنی راہ لو۔'' بظاہر عرب اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے مزید سمجھایا کہ دونوں کے لیے گناہ سے بچنے کا ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے کہ وہ ایسی غیر اخلاقی شادی کا خیال ترک کردیں۔

یہ ایک اکیلا واقعہ نہیں ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ نے مسلسل اس بات کی جدوجہد کی کہ عورت کی فطری انفرادیت اس کو واپس مل جائے۔ اس سلسلے میں وہ ڈرامائی واقعہ بھی ہے جس میں ایک نوجوان لڑکی نے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی مداخلت چاہی تھی کہ اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی اس کے چچیرے بھائی سے کی جارہی ہے۔ اس کے باپ نے شادی کی تاریخ بھی طے کردی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے ابتدا میں اسے مشورہ دیا کہ چونکہ اس کے باپ نے تمام معاملات بالکل ہی طے کردیے ہیں تو شادی ہوجانے دے۔ لڑکی نے کہا کہ ''مگر میں اس کو پسند نہیں کرتی۔ میں ایسے شخص کی بیوی بن کر کیسے رہوں گی جسے میں ناپسند کرتی ہوں؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے کہا: ''اسے اپنی پسند کا شوہر اختیار کرنے کی پوری آزادی ہے، اگر وہ سچ مچ اپنے عم زاد کو پسند نہیں کرتی'' وہ بولی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کا فرمان سننے کے بعد مجھے سکون ہوگیا۔ ویسے میں اب اس عم زاد کو کچھ کچھ پسند کرنے لگی ہوں اور کسی دوسرے کی بیوی بننا نہ چاہوں گی۔ لیکن مجھے اس پر اعتراض تھا کہ میری رضامندی لیے بغیر سب کچھ طے کردیا گیا۔ اس موضوع پر فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ سننے کے بعد اب میں ساری

دنیا کو یہ آوازِ بلند بتاؤں گی کہ والدین کو یہ حق نہیں ہے کہ لڑکیوں کی مرضی کے خلاف من مانی شادیاں طے کریں۔ اِن چھوٹ پٹ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی بدولت عرب ذہن کس طرح جہالت کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو رہا تھا اور عورتوں کی زندگی میں ایک نئی اور خوشگوار ہوا چلنے لگی تھی۔ ابھی یہ ہوائیں مغرب میں نہیں پہنچی تھیں۔
یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ عورتوں کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے خیالات شروع سے ہی بے انتہا ہمدردانہ تھے۔ قرآنِ کریم کی جو آیات لڑکیوں کے زندہ دفن کیے جانے کے خلاف پہلے نقل ہوئی ہیں وہ مکی آیات ہیں، یعنی ہجرت کے پہلے ہی نازل ہو چکی تھیں اور شروع ہی سے محمدی تبلیغ کے اہم اجزا تھیں۔ اب نظری اعتبار سے عورت کا خود ایک اقتصادی مرتبہ تھا اور وہ مرد کی دست نگر ہی نہیں رہ گئی تھی۔ سماج میں اس کی ایک جگہ تھی اور اس کے آزاد اقتصادی حقوق تھے۔

اسلام نے جو نیا سماجی نظام بنایا اس میں حقوق نسواں کے تعلق سے جو کچھ کہا گیا ہے اس کی حیثیت صرف منفیانہ نہیں ہے۔ اب اس کو باپ کی جائداد میں بھائیوں کے ساتھ خود ایک حصہ ملنے والا تھا۔ گھر کے اندر اس کی حیثیت ایک مالکہ کی تھی اور نئے سماجی نظام میں وہ برابر کی شریک تھی۔ فی الحقیقت دنیا میں جو تبدیلیاں بہت بعد میں آئیں اُن کے آغاز کی کڑیاں تعلیماتِ محمدی ہی میں ڈھونڈی جا سکتی ہیں۔

اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اسلام نے عورت کے لیے اہم مگر باہمی تعاون کا کردار متعین کیا ہے۔ اگر قیادت مرد کے ہاتھ میں بھی رہتی تو عورت کا کردار غلامانہ، عاجزانہ اور مسکینی کا نہیں رہ گیا تھا۔ اسلام لانے میں کئی عورتیں آگے آگے تھیں اور اس کے لیے انھیں شدائد جھیلنا پڑے، لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ ابتدائے اسلام سے حضرت خدیجہ کبریٰ کا کردار ایسے تعاون کا ہے جس کے احسان سے اسلام کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ خاندانِ بنی ہاشم کی عورتیں شعب ابی طالب میں محصوری کے

مصائب جھیلتی رہیں۔ ہجرتِ حبشہ اور پھر ہجرتِ مدینہ میں عورتیں شریک و سہیم رہیں۔ حضرت فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا نے بچپن سے آخری سانسوں تک اسلام کی خدمت میں ہر مشکل کو ہنستے ہوئے برداشت کیا اور ان سب نے صفحاتِ تاریخ پر اپنے نقش چھوڑے۔ امہات وصحابیات میں اور بھی کئی اہم شخصیتیں گزری ہیں لیکن یہ نام شماری کا موقع نہیں ہے۔

اس فعال تعاون کے علاوہ سب سے بڑی تبدیلی جو اسلامی نظام لایا وہ عورت کے حقِ ملکیت کو تسلیم کرنا تھا۔ اس کی بدولت وہ ایک آزاد اقتصادی شخصیت کی مالک ہوگئی۔ قرآن کریم نے صاف لفظوں میں اس کا مکرر اعلان کیا کہ جو کچھ وہ کمائے گی وہ اس کا حق ہے اور ترکے میں بھی اس کا ایک مقرر حصہ ہے:

۱) لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ. (النسا:)
[مرد جو بھی کسب کرتے (کماتے) ہیں وہ ان کا نصیب ہے اور عورتیں جو بھی روزی کماتی ہیں وہ ان کے حصے کی ہے۔]

۲) لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ص وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ط نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا o (النساء:۷)
[ماں باپ اور اقربا مرنے پر جو کچھ چھوڑیں خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ اس سے مرد بھی بہرہ ور ہوں اور عورتیں بھی بہرہ اندوز ہو سکتی ہیں، ان کا حصہ مقرر ہے۔]

اس کا یہ اثر ہوا کہ طلاق کے بعد خود اس کے پاس مہر کے علاوہ اپنی کمائی ہوئی دولت اور اپنا ترکہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ طلاق کے ساتھ مرد سے زنِ مطلقہ کو نان ونفقہ بھی دلوایا گیا۔ اس کا اثر طلاق پر پڑا۔ اسلام میں طلاق ممنوع نہیں لیکن مستحسن بھی نہیں ہے۔

اگر میاں بیوی میں غلط فہمی ہو جائے تو باہمی طور سے یا حَکم کے ذریعے سے سلجھائے جانے کے احکام ہیں۔ بعض اوقات نوبت زور زبردستی کی بھی پہنچ جاتی تھی لیکن اس کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔ بہرصورت اگر علیحدگی کے سوا چارہ نہ رہ جائے تو بھی سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ طلاق کے مقابل عورتوں کو خلع کا بھی حق دیا گیا۔

ان تمام احکام نے بہت بڑی آبادی کو آزادی اور اطمینان و سکون و محبت کی ایک نئی زندگی دی۔ اس تبدیلی نے کایا پلٹ دی۔ دوسری تبدیلی جس نے انقلابی حرکت پیدا کی وہ غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ کیے جانے والے بہیمانہ اور ظالمانہ سلوک کا خاتمہ تھا۔ غلامی کا نظام تو عالم گیر تھا اور عالمی سطح پر تبدیلی لائے بغیر انسانوں کی خرید و فروخت اور ان کی آزادی کے خاتمے کے خلاف کوئی مؤثر اقدام ممکن نہیں تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے اس مسئلے پر ایک دوسرے پہلو سے وار کیا۔ انھوں نے خود غلاموں کو آزاد کیا اور دوسروں کو یہ ترغیب دی کہ مجبور انسانوں کی بیڑیاں کاٹیں۔ یہ افسانہ اس قابل ہے کہ اسے اپنے سیاق و سباق کے ساتھ قدرے تفصیل سے بیان کیا جائے۔

غلامی اور اسلام

اس موضوع پر الگ سے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن جو لوگ اس تشاغبی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں کہ اسلام غلامی کے حق میں ہے، انھیں ان حقائق پر تاریخی اعتبار سے غور کرنا چاہیے۔ غلامی ایک منظّم ادارہ بن چکی تھی۔ کوئی خوشی سے غلام نہیں بنتا تھا۔ یا تو جنگ میں مفتوح ہونے کے بعد گرفتار ہو کر غلام بنتا یا غلاموں کی تجارت کرنے والا گروہ کسی طرح گرفتار کر لیتا اور پھر قیمت لے کر فروخت کر دیتا۔ اب یہ انسان خریدنے والے کی ملکیت ہو جاتا۔ اس کو اس غلامی سے کوئی چھڑا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس پر جنگ و جدل کی

نوبت آ سکتی تھی۔ اس لیے جو ایک بار غلام ہوا اس کی قسمت پر ہمیشہ کے لیے مہر مایوسی لگ گئی۔ غلام کے منحوس مالک کو ہر طرح کا حق حاصل، وہ جو کام چاہے لے، اس پر جو چاہے ظلم کرے، داد فریاد نہیں تھی۔

غلامی کا تصور بہت قدیم ہے۔ چنانچہ فلسفیوں کے یہاں بھی ہم انسانوں کی دو قسموں سے دوچار ہوتے ہیں۔ (۱) پیدائشی آزاد (۲) پیدائشی غلام۔ مؤخر الذکر کی پیدائش ہی اول الذکر کی خدمت کے لیے ہوتی تھی۔ ارسطو کے نزدیک بھی رواج غلامی ضروری تھا۔ اس کے خیال میں ریاست کے قیام کی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ اجتماعی زندگی کو بہتر بنایا جائے۔ اس کے لیے غلاموں کی حاجت تھی کہ سوسائٹی جو کام نہیں کرتی یا نہیں کرنا چاہتی، وہ ان کاموں کو انجام دیں۔ یونانی بڑے عہدوں کو سنبھالتے اور آئینی مجلسوں کی نیابت کرتے۔ عام اور ذلیل کام یہ غریب غلام انجام دیتے۔ اس کے برعکس رومیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ سب آزاد پیدا ہوئے ہیں لیکن جنگی قیدیوں اور قرض ادا نہ کر سکنے والوں کو وہ غلام بنا لیتے تھے۔ غلاموں کی اولاد بھی غلام ہی رہتی۔ یہودیوں میں غلام دو طرح کے رہتے تھے۔ ایک تو وہ جو مذہبی جرم یا عدم ادائیگیِ قرض کے سلسلے میں غلام بنائے جاتے تھے۔ دوسرے جنگی قیدی۔ یہ غلام گھر کے کام کاج کے علاوہ سماجی اور زرعی کام بھی کرتے تھے۔ اس محنت و مشقت کے باوجود سوسائٹی میں انھیں ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسپارٹن غلام صرف ایک مالک کے غلام نہ ہوتے بلکہ ہر شخص ان سے غلاموں جیسا سلوک کرتا اور اذیتیں دیتا۔ لبنان میں غلام کو ذاتی مظہر کا حق بھی نہیں تھا۔

عربوں میں رومیوں کی طرح یہ خیال بھی نہیں تھا کہ ہم قوموں کو غلام نہ بنائیں۔ وہ عرب جنگی قیدیوں کو بھی غلام بنا لیتے تھے۔ جب کسی باعزت قیدی کو رہا کرتے تو اس کی پیشانی کے بال تراش لیتے اور اس پر فخر کیا کرتے۔[1] غلاموں کی خرید و فروخت عام

[1] جاہلیت و اسلام: یحییٰ نوری: ۶۹۱ (طبع ششم) : بلوغ الارب فی احوال العرب: ۳:۱۴

تھی اور اس سے عرب کافی کما لیا کرتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن جدعان دورِ جاہلیت کا سب سے بڑا غلام فروش تھا۔ غلاموں کو کوئی اختیار نہ تھا۔ حد یہ کہ وہ اپنی ضرورت کی بھی کوئی چیز خرید نہ سکتے تھے۔

غلام بنانے کا ایک طریقہ 'استاسر' بھی تھا۔ اگر کسی بیابان میں کسی غیر قبیلے کا کوئی فرد یا جماعت ملتی یا اس پر غلبہ پانا ممکن ہوتا تو کہتے 'ستر' یعنی قید میں آجاؤ۔ وہ یا تو اقرار کر لیتا یا مر کر جان دے دیتا۔ اگر زندہ رہتا تو مملوک ہو جاتا اور غلبہ پانے والا اسے بیچ ڈالتا۔ اس زمانے کے عربوں میں یہ مسلمہ طریقہ تھا۔

ربا اور سود در سود بھی عام تھا جو سو فی صد تک پہنچ جاتا تھا۔ نتیجے میں قرض لینے والا کبھی یہ قرض ادا نہ کر پاتا۔ اس کی کل جائداد ہی نہیں زن و دختر بھی چلی جاتی اور خود غلاموں کی سی زندگی گزارنے کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہ پاتا۔

غرض غلامی کی زندگی عرب جاہلی میں بقیہ دنیا کی طرح ایک اذیت ناک اور ناقابل شکست رواج کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ انتہا یہ تھی کہ خود غلام مجبوری اور بے بسی کی اس زندگی پر قانع ہو گئے تھے۔ وہ ہر طرح کے اختیارات سے محروم تھے۔ سماج کی نظروں میں پست و ذلیل تھے۔ ان کا کام چارپایوں کی طرح محنت و مشقت کیے جانا تھا۔ رکنا ستانا بھی ناممکن تھا۔ انکار تو دور کی بات تھی۔ غلاموں میں جنگی قیدیوں کے ساتھ یہ رعایت تھی کہ وہ فدیہ دے کر رہائی حاصل کر سکتے تھے، یا بلا فدیہ بھی صلح کے ذریعے سے آزاد کیے جا سکتے تھے، لیکن انھیں دوبارہ غلام بنایا جا سکتا تھا۔ رواج تو یہ تھا کہ یہ بے چارہ قتل بھی کیا جا سکتا تھا اور اس کی داد فریاد کوئی نہیں تھی۔ غرض وہ انسان ہوتے ہوئے بھی ایک غیر انسانی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔

سب سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کے دردمند دل نے اس بربریت کو محسوس کیا اور اقتدار میں بھی آنے سے پہلے غلاموں کو آزاد کرانے کی محبت آمیز مہم کا آغاز

کیا۔ محبت بھرے اقدام اور نیک کام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے دائرۂ کار میں اہم مقام رہا ہے۔ مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کا یہ ارشاد ہم تک پہنچایا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا:

اَرَاَیْتَ الرَّجُلَ یَعْمَلُ مِنَ الْخَیْرِ وَ یَحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَیْه۔ قَالَ تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَی الْمُؤْمِن (صحیح مسلم)

[کیا آپ نے ایسا شخص دیکھا ہے جو اچھا عمل کرتا ہے اور اس کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، (آپ نے جامع جواب دیا) کہ یہ تو مومن بندے کی نقد بشارت ہے۔]

یعنی نیک بندوں کے کاموں کا جو اجر اللہ دینے والا ہے وہ تو ملے گا ہی اور اپنی جگہ پر ہے، لیکن اس دنیا میں بھی نیک نامی اور شہرت کی شکل میں پاتا ہے۔ انھیں جذبات کے تحت اسلام نے غلامی کے ادارے کے خلاف پہلی بھرپور انسانی آواز بلند کی۔ امام کے الفاظ میں اس کا خلاصہ یہ تھا:

لاتکُنْ عَبْدَ غَیرِك وَقَد خَلَقَكَ اللّٰهُ حرًّا (تم کسی غیر کے غلام کیوں بنو، جب اللہ نے تمھیں آزاد پیدا کیا ہے؟) اس میں روئے سخن ان لوگوں کی طرف تھا جو قرض وغیرہ لے کر اپنی آزادی کھو دیتے ہیں۔ ان سے بھی مخاطبت تھی جو غلام ہیں تاکہ وہ غلامی کے خاتمے کی مکاتبت اور تدبیر وغیرہ کے ذریعے سے کوشش کریں، لیکن فضا کو جس چیز نے سازگار بنایا وہ تو اسلام کا پیغام مساوات تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے غلاموں کو آزاد کرنے کا ثواب بار بار مسلمانوں پر وارد کیا اور خود اپنے غلام کو آزاد کر کے مثال قائم کی اور ان مجبور غلاموں کو آزادوں کا سا حق دلوایا۔ یہ دلوں کا انقلاب بھی تھا اور ایک سماجی، اقتصادی انقلاب بھی۔ سارے تصورات ہی اُلٹ پلٹ ہو گئے۔ انگلینڈ میں ۱۸۴۰ء تک، فرانس میں ۱۸۴۸ء تک، ہالینڈ میں ۱۸۶۳ء تک، امریکہ میں ۱۸۹۰ء تک انسدادِ غلامی

کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا گیا تھا۔

غلاموں میں دو طرح کے غلام تھے۔ ایک زرخرید یا بعوض قرض وغیرہ مملوک بن جاتے اور جنگی قیدیوں کی صورت میں آتے اور چوں کہ اس وقت تک جنگی قیدیوں کے لیے کوئی الگ سے معاہدہ، رواج یا انتظام نہیں تھا، نہ ایسے کیمپ تھے جہاں ان کی دیکھ بھال کی جاسکتی۔ اس لیے انھیں مختلف لوگوں کی نگرانی میں غلاموں کی حیثیت سے دے دیا جاتا تھا۔ عرب ایک جنگجو قوم تھے اور وہ ہارے ہوئے مخالف سے بھی برتاؤ کرتے وقت نسبتاً کچھ نرم رہتے تھے۔ اس لیے جنگی قیدی، غلاموں کی حالت ذرا مختلف تھی، لیکن غلام پھر بھی غلام تھے۔ اسلام نے صرف جنگی قیدی غلاموں پر ہی ترحم کی نظر نہیں کی، بلکہ اور طرح کی غلامیوں پر بھی قدغن کی اور رحم و انصاف کا حکم دیا۔ سورۂ بلد پارہ ۳۰ میں قرآن کریم صاف کہتا ہے:

وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ o فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ o وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ o فَكُّ رَقَبَةٍ o اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ o يَّتِيْمًا ذَامَقْرَبَةٍ o اَوْ مِسْكِيْنًا ذَامَتْرَبَةٍ o (البلد:۱۶-۱۰)

[اور ہم نے اس (انسان) کو دونوں (اچھی اور بُری) راہیں دکھا دیں۔ پھر وہ گھاٹی سے ہوکر کیوں نہیں گزرا۔ اور تم کو معلوم ہے کہ یہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی (کی) گردن کا (غلامی یا قرض سے) چھڑانا یا بھوک کے دن رشتہ دار یتیم یا خاکسار محتاج کو کھانا کھلانا۔]

غلاموں کو آزاد ہونے کے بعد آزادی کے تمام حقوق مل جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے رشتے کی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحشؓ کا نکاح ایسے ہی آزاد کردہ غلام زید بن حارثہؓ سے کردیا۔ اسی طرح ایک اور آزاد شدہ غلام نے خاندانِ بنی بیاضیعہ میں نکاح کا پیغام دیا تو لوگوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ سے پوچھا کہ کیا ہم اپنی بیٹیاں غلاموں سے بیاہ دیں۔ آپ نے اس آیت کی روشنی میں اجازت دی:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ o (الحجرات:۲۶:۱۳)

[اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور ہم ہی نے تمھارے قبیلے اور برادریاں بنائیں تاکہ ایک دوسرے کو پہچانیں، بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ یقیناً اللہ بڑا واقف کار اور باخبر ہے۔]

قرآن کریم نے یہ ترغیب دی ہے کہ جنگی قیدیوں کو معاوضہ لے کر یا بے معاوضہ چھوڑا جاسکتا ہے۔ (سورہ محمد: ۴) چنانچہ جنگِ بدر کے قیدی فدیہ لے کر چھوڑ دیے گئے تھے۔ قرآن مجید میں مکاتبت کا بھی حکم ہے۔ مکاتبت کا مفہوم یہ ہے کہ غلام اور مالک میں یہ اقرارِ باہمی ہوجائے کہ اتنی رقم ادا کردینے پر غلام آزاد ہوجائے گا۔ اس کی دو شکلیں تھیں۔ ایک تو یہ بالاقساط ادائیگی ہو اور جتنا وہ ادا کرتا جائے اُسی تناسب سے اس کو آزادی بھی ملتی ہے۔ اس کو مکاتبتِ مطلق کہتے ہیں۔ دوسری یہ تھی کہ جب تک کل رقم ادا نہ کردے کچھ بھی آزاد نہ ہوگا۔ اسے مکاتبتِ مشروط کہتے ہیں۔ یہ رقم ایک مقررہ مدت میں ادا کرنا ہوتی تھی۔ فرمانِ قرآن:

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ق وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰكُمْ ط (النور:۱۸:۳۳)

[اور تمھارے غلاموں اور لونڈیوں میں جو مکاتبت ہونے (کچھ رقم کی شرط آزادی کا سرخط لینے) کی خواہش کریں تو تم اگر ان میں صلاحیت دیکھو تو مکاتبت کردو اور خدا کے مال سے جو اس نے تمھیں عطا کیا ہے ان کو دے دو۔]

جب کہ بتایا جاچکا ہے قیدیوں کو قتل کردینے کا بھی رواج تھا لیکن مسلمان نے کبھی کسی قیدی کو قتل نہیں کیا۔ کیونکہ یہ احکامِ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کے منافی ہوتا۔ اگر کبھی

کوئی قیدی قتل ہوا بھی تو اُس وقت جب اس کی ذات سے مسلمانوں کے عام معاشرے
کو جانی و مالی نقصان کا خطرہ لاحق ہوا۔ ایسی ہی ایک خطرناک ہستی نضر بن حارث کی تھی۔
پھر بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ نے اسے جان کی امان دی۔ لیکن جب وہ ایذا رسانی سے
باز نہ آیا تو امان کی مدت گزرنے پر قتل کر دیا گیا۔ اگر کوئی غلام مسلسل سات سال تک
خدمت کر لیتا تو ایک حدیث کے مطابق خود بخود آزاد ہو جاتا (وسائل الشیعہ)۔ وصیت
کے ذریعے بھی غلام آزاد کیا جا سکتا تھا۔

'تدبیر' کے ذریعے بھی غلام آزادی حاصل کر سکتا تھا۔ مثلاً غلام آقا سے یہ شرط
منوالے کہ وہ آقا کے مرنے کے بعد آزاد ہو جائے گا تو آقا کی جان نکلتے ہی اس کی
آزادی شروع ہو جاتی ہے۔ بعض ایسی صورتیں اور ہیں جن میں غلام خود بخود آزاد ہو جاتا
ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے غلام کے کسی جزو کو آزاد کرے، تو جزو کی آزادی فقہ اسلامی
کی نظر میں کل کی آزادی بن جائے گی۔

اسی طرح اگر (۱) باپ (۲) ماں (۳) دادا (۴) دادی (۵) اولاد (۶) چچا
(۷) پھوپھی (۸) ماموں (۹) خالہ (۱۰) بھائی (۱۱) بہن (۱۲) بھتیجا (۱۳) بھانجے کا
کوئی مالک ہو جائے، ایسے اشخاص (غلام) فوراً آزاد ہو جائیں گے۔ یعنی جیسے ہی یہ افراد
اس شخص کی ملکیت میں داخل ہو جائیں گے ان کو از خود آزادی مل جائے گی۔ اگر غلام
نابینا یا زمیں گیر ہو جائے تو مالک کی ملکیت سلب ہو جائے گی اور غلام آزاد ہو جائے گا اور
اس کی ضروریاتِ زندگی اسلامی بیت المال سے پوری کی جائیں گی۔

☆ اگر میدانِ جنگ میں آقا سے پہلے غلام دائرۂ اسلام میں آ جائے تو اس کی غلامی کا
خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔

☆ اگر مالک اپنے غلام کی ناک یا کان کاٹ لے تو بھی غلام خود بخود آزاد ہو جائے گا۔

☆ اگر ماں باپ میں سے ایک بھی آزاد ہو تو دوسرا بھی آزاد ہو جاتا ہے۔

☆ اگر کوئی مرض جذام یا برص میں مبتلا ہو جائے تو وہ بھی آزادی حاصل کر لیتا ہے۔

☆ اگر کسی ایسے دولت مند شخص کا انتقال ہو کہ غلام کے سوا اس کا کوئی وارث نہ ہو تو حاکم
شرع کے لیے لازم ہے کہ وہ اس غلام کو اس دولت سے خرید کر آزاد کر دے اور بقیہ
دولت اس کے حوالے کر دے۔

☆ کئی ایسے مواقع ہیں جہاں مسلمانوں کے لیے غلام کا آزاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔
مثلاً کسی نے نذر کی یا رمضان میں (قبل از وقت) افطار کر لیا تو ایسی صورت میں مسلمان
پر واجب ہے کہ وہ غلام آزاد کرے۔ اگر کسی کو سہواً قتل کر دے یا قسم کھا کے توڑ دی ہے تو
بھی غلام کا آزاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

غرض خوشی، رضامندی سے غلام آزاد کرنے کے علاوہ ایسے قوانین وضع کیے
گئے تھے، جن کے تحت غلاموں کو آزاد کرنا لازم تھا۔ اس طرح انسدادِ غلامی کی تحریک کو
زبردست تقویت پہنچائی گئی اور دیکھتے دیکھتے غلامی کی رسم کی طرف سے مسلمانوں اور
عربوں کے دل پھر گئے۔ غلاموں سے عام طور پر بہتر سلوک کیا جانے لگا اور خود غلام اپنی
روح کو آزاد تصور کرنے لگے۔ یہ بھی اسلامی تاریخ میں دیکھنے میں آیا کہ غلام بڑے
بڑے سیاسی عہدوں پر فائز ہوئے بلکہ بادشاہت کے تخت تک پہنچ گئے۔ یہ سب کچھ کسی
ظلم و جبر اور خون و فساد کے بغیر صرف انقلابِ قلب سے وجود میں آیا۔

ایک بڑا حلقہ غلامی سے اس لیے بچ گیا تھا کہ مسلمانوں کو اسیر یا غلام بنانا جائز
نہیں ہے، جو غیر مسلم قومیں مسلمانوں سے برسرِ پیکار نہ ہوں انھیں امام مالک، امام شافعی
اور امام حنبلؒ غلام بنانا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ صرف جہاد کے اسیرانِ جنگ کو (جن کی دشمنی
واضح اور نمایاں تھی) غلام بنائے جانے پر روک نہیں لگی۔ فدیہ وغیرہ کی راہیں اُن کے
لیے بھی کھلی ہوئی تھیں۔

جنگی قیدیوں کے سلسلے میں ایک وضاحت ضروری ہے۔ یہ لازمی نہیں تھا کہ

سارے جنگی قیدی حتماً غلام بنا لیے جائیں۔ یہ مسئلہ اُس زمانے کا امام طے کرتا تھا اور جس طریق کار میں عام فائدہ یا نیک صلاح نظر آتی اسی کے مطابق حکم دیتا تھا۔ مسلمان سپاہیوں کا یہ فرض تھا کہ وہ لڑائی کے ختم ہوتے ہی سارے قیدی امام کی خدمت میں لائیں۔ کسی کو خود سے یہ حق نہیں تھا کہ وہ انھیں کوئی اذیت یا تکلیف دے۔ اب امام کو یہ اختیار تھا کہ وہ قید و شرط کے بغیر آزاد کیے جانے کا حکم دے دیں۔ اگر مصلحت اس کی متقاضی ہو تو ان سے کچھ رقم لے کر انھیں رہا کر دیا جائے۔ اب اگر حالات کا تقاضا ہوتا کہ ان کو قید کر لینا ضروری ہے تو انھیں کسی کی ملک میں دے دیا جاتا تھا کیونکہ اس وقت حکومت کی جانب سے اتنے قیدیوں کو یکجا کیمپ وغیرہ میں رکھنے کا انتظام نہیں تھا۔ اس آخری صورت میں یہ قیدی اپنے حسن خدمت سے یا فدیہ دے کر یا مکاتبت وغیرہ کے ذریعے آزادی حاصل کر سکتے تھے۔ اس طرح جنگی قیدیوں کی تھوڑی ہی سی تعداد غلاموں کی صف میں شامل ہوتی تھی۔ ان کے لیے یہ بھی حالات پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ سازگار اور بہتر ہو چکے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اقدامات نہ صرف عرب میں بلکہ عربوں کی وساطت سے دنیا کے مختلف حصوں میں انسدادِ غلامی کی تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

نئی فضا

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام نے غلامی کے سلسلے میں جو اصلاحیں کیں اس سے ایک بالکل ہی نئی فضا پیدا ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ غلاموں کا حلقہ گھٹنے لگا بلکہ ان سے انسانوں جیسا سلوک کیا جانے لگا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسلامی قوانین کا مالک اور غلام پر یکساں نفاذ ہونے لگا۔ نماز، روزہ اور دوسرے فرائض کی ادائیگی میں

نابرابری نہیں تھی۔ مسجدِ رسول میں انصار اور قریشی صحابۂ کرامؓ کی موجودگی کے باوجود اذان کا فریضہ آزاد شدہ غلام بلالؓ کے سپرد تھا۔ غلام اور آزاد ایک ہی صف میں کھڑے تھے اور اسلام میں ملوکیت کے نمودار ہونے کا کوئی اثر اس بنیادی مساوات پر نہیں پڑ سکا۔ اقبال کا وہ مشہور شعر اسی جذبے کی ترجمانی کرتا ہے:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

رسول اللہؐ برابر لوگوں کو یہ ہدایت کیا کرتے تھے کہ غلاموں سے اچھا برتاؤ کریں۔[1] ایک بار آپ نے ابنِ مسعودؓ کو ایک غلام کو کوڑا مارتے دیکھا۔ فوراً ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''خدا تم پر اس سے زیادہ اقتدار رکھتا ہے جتنا تم اس غلام پر۔'' ایک بار ایک سوار کو دیکھا کہ اس کا غلام پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ فرمایا: ''اس کے بھی جان ہے۔ یہ تیرا بھائی ہے۔ اسے بھی بٹھا لے''۔ اسی طرح جب جنگِ بدر کے قیدی سامنے لائے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے تاکید کی کہ ان سے اچھا برتاؤ کرنا۔

حضرت علی علیہ السلام جب کوئی لباس خریدنا چاہتے تھے تو دو جوڑے خریدا کرتے تھے۔ ایک اپنے لیے اور دوسرا اپنے آزاد کردہ غلام قنبر کے لیے۔ دونوں جوڑے قنبر کے سامنے رکھ دیتے تھے اور کہتے تھے، اس میں سے جو تمھیں پسند ہو لے لو۔ آپ کے پوتے امام زین العابدینؑ نے ایک بار گرمیوں کے دنوں میں غلام کو دیکھا کہ گہری نیند سو رہا ہے، لیکن گرمی کی شدت سے چہرہ اور پیشانی پسینے سے تر ہو رہے ہیں۔ آپ اس کے قریب جا کر بیٹھ گئے اور اس کو پنکھا جھلنا شروع کیا کہ آرام سے سو سکے۔ یہ اسلامی تعلیمات ہی کا نتیجہ تھا کہ لوگ غلاموں سے ایک فردِ خاندان کا سا برتاؤ کرنے لگے تھے۔ وہ ان سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتے اور ان پر بیٹے کی طرح بھروسا کرتے تھے۔

۱۔ مسلمانوں کا نظمِ مملکت: پروفیسر حسن ابراہیم حسن، فواد یونیورسٹی، مصر، مترجم علیم اللہ صدیقی (اعلیٰ پریس دلی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کا ارشاد ہے کہ ''اپنے غلاموں اور کنیزوں کو غلام اور کنیز کہہ کر نہ پکارو، انھیں فرزند، رزیز اور دختر عزیز کہہ کر پکارو'' [1] جناب فِضّہؑ جناب فاطمہ زہراؑ کی کنیز تھیں، لیکن حسنِ سلوک کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ گھر کے کام کاج فضّہ کرتیں تو دوسرے دن خود جناب فاطمہؑ اپنے ہاتھوں سے انجام دیتیں۔

یہی نئی ترقی پسندانہ فضا ایک زبردست تحریک کی پیامی بنی۔

دولت کی تقسیم

اسلام کے پہلے لوگ مال و دولت کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک زندگی کی بقا کے لیے مال کی ضرورت تھی۔ مال اور دولت کے بغیر وہ ضروری اشیا حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ جس کے پاس جتنا زیادہ مال ہوتا وہ اتنا ہی مطمئن اور مکرم ہوتا۔ اس اطمینان اور اکرام کو حاصل کرنے کے لیے لوگ لوٹ کھسوٹ اور ملک گیری میں مبتلا ہونے لگے تھے اور حق داروں کو ان کے حق سے محروم کرنے لگے تھے۔ دوسروں سے جبری بیگار لینا، دوسروں کو غلام بنانا، دوسروں کی محنت کے پھل سے ان کو منافع نہ ہونے دینا یہ وہ حربے تھے جن سے دولت بڑھائی جاتی تھی۔ روزی کے لیے انسان سرمایہ داروں کے دروں پر جبہ سائی کرنے لگتا۔ اسے اپنے قوت بازو پر بھروسا نہیں رہتا۔ وہ خودداری بھی کھو دیتا۔ اسلام میں اس نظریے کی ایک دورس طریقے پر تردید کی گئی۔ مقدس صحیفے میں بار بار یہ یقین دلایا گیا کہ قدرت نے اسی زمین میں وہ سب سامان مہیا کر دیے ہیں جس سے انسان اپنا رزق خود مہیا کر سکتا ہے۔ رزق روزی اور ضروری اشیا کی فراہمی کی یقین دہانی خود اللہ نے کی ہے۔ شرط یہ رکھی ہے کہ انسانوں کو اس کے لیے کسب و محنت کرنا ہوگا۔ انسانی حیات کو باقی

[1] تاریخ تمدن: جرجی زیدان ۴: ۴۵۴ (بحوالہ: ''اسلام اور غلامی'')

رکھنے کے لیے رزق ضروری ہے۔ اس کے حصول کے لیے وہ کیا کیا جتن نہیں کرتا۔

کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا، سر چھپانے کو سایہ نہ ہو تو انسان سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور بُرے کام سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ان بُرائیوں سے روکنے کے لیے اسلام نے جو راستہ تجویز کیا ہے وہ اس دور تک ناشنیدہ تھا۔ یہ الٰہی یقین دہانی کہ رزق سبھی کو فراہم کیا جائے گا، جو حکومت طریق اسلامی کو اپنانے کی مدعی ہوتی اس کے لیے یہ لازمی ہو گیا کہ وہ ہر شہری کے رزق کی فراہمی کا انتظام کرے اور افرادِ ملت میں جو مالدار ہوں ان پر یہ فرض عائد ہو گیا کہ وہ منشائے الٰہی کو پورا کرنے میں مدد کریں۔ یہ وہ نشانہ ہے جس کے حصول کے لیے حکومتیں آج بیسویں صدی کے خاتمے تک کوشاں ہیں۔

اسلام نے فراہمیِ رزق کے لیے صرف یقین دہانی نہیں کی بلکہ اس نے انسان کو یہ بھی یاد دلایا کہ یہ دنیا دار العمل ہے اور اسی لیے قوتِ عمل بھی دی گئی ہے اور یہ صلاحیت بھی عطا کی گئی ہے کہ وہ رزق حلال کے لیے کائنات کو تسخیر کر سکے۔ رسول اللہ، ائمہ ہدیٰ، اہل بیت کرام اور محترم صحابیوں نے خود محنت و مشقت کی زندگیاں گزاریں اور اپنا رزق خود حاصل کیا۔ دوسروں کے دست نگر کبھی نہیں بنے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام نے ہر فرد کے لیے کسب معاش اور محنت ضروری سمجھی کیونکہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق تبھی مل سکتا ہے جب وہ حیثیت اور طاقت کے مطابق سماج کو محنت کی شکل میں کچھ نہ کچھ دیا کرے، ورنہ ایسا معاشرہ وجود میں آ جائے گا جس میں ایک طبقے کا کام کھیتی باڑی اور مزدوری کرنا ہوگا اور دوسرا صرف اس محنت کا پھل کھائے گا، جو سماجی ظلم کے مرادف ہے۔ اس طرح اللہ نے اپنے محکم قانون میں وہ رہبرانہ نکات بتا دیے ہیں جن کی پابندی ایک عادلانہ نظام کی بقا کے لیے ضروری ہے۔

قرآن مجید کی پہلی ہی آیت میں یہ اعلان کر دیا گیا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ [تمام تعریفیں اور بڑائیاں اللہ کے لیے ہیں جو تمام

دنیاؤں کا پالن ہار ہے۔]

اس کی شان ربوبیت عام ہے۔ اس میں نہ قبیلوں کی قید ہے، نہ مذہبوں کی، نہ ملکوں کی، نہ طبقوں کی اور نہ زبانیں بولنے والوں کی۔ اس عام ربوبیت نے تمام کائنات کو اپنے سایۂ دامن سے لے لیا ہے اور ان معنوں میں خلق اللہ ایک ہی اُمت ہوگئی ہے۔ حقیقت کا صحیح درک نہ کرنے والوں نے ربوبیت کے معاملے میں بھی عادلانہ اصلیت کو دبا کر اختلافات اور انشقاقات کو اُچھال دیا ہے۔ یہ اختلاف و انحرافات و انشقاقات غیر حقیقی اور خود انسان کے پیدا کردہ ہیں۔ وہ بھی انسانوں کا پالن ہار اور رزق رساں ہے۔

اتنی روزی کی فراہمی جو زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے لیے کافی ہو، انسان کی پہلی حاجت ہے۔ جو نظام اس کے راستے میں حائل اور حارج ہو وہ عدل و انصاف پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ اسلام نے بتایا کہ یہ ملک و زمین سب اللہ کی ہے۔ مالک حقیقی وہ ہے تو دنیا سے اور اس دنیا میں جو کچھ بھی ہے اس سے منتفع ہونے کا حق بھی عامۂ خلائق کا ہونا چاہیے اور پھر رزق کی ضمانت بھی اُسی کی جانب سے بالتکرار کی گئی ہے:

۱) اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ○ (الذاریات:۲۷:۵۸)

[بے شک اللہ ہی روزی دینے والا، بڑی مضبوط قوت والا ہے۔]

۲) وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ○ (الرحمٰن ۲۷:۱۰)

[اور اللہ نے خلق کے نفع کے لیے ہی زمین پیدا کی۔]

۳) وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ○ (الحجر۱۴:۲۰)

[اور ہم نے تمھارے لیے (زمین میں) معیشت کے سامان بنا دیے اور ان کے لیے جن

کو تم روزی نہیں دیتے۔]

۴) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ۚ (الھود ۱۲:۶)

[اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اللہ نے اپنے ذمے لے لی ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے اور وہ کہاں سونپا جاتا ہے۔]

۵) وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ○ (الذاریات:۲۶:۲۲)

[اور تمھارا رزق اور جس شے کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ آسمان میں (اللہ کے ذمہ) ہے۔] (آسمان میں روزی ہونے کا مطلب بارش اور آفتاب کی گرمی سے ہے جس پر زراعت و باغبانی کا انحصار ہے)

۶) وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۚ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ (النمل ۲۰:۶۴)

[اور آسمان و زمین سے تم کو روزی کون پہنچاتا ہے؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہے؟]

۷) كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○ (البقرہ:۶۰)

[اللہ کے دیے ہوئے رزق سے خوب کھاؤ پیو (لیکن) زمین پر شرارتیں کرتے نہ پھرو۔]

۸) وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ ○ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ○
(الحجر:۲۰۔۱۹)

[ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس پر پہاڑ قائم کیے اور اس میں ہم نے ہر طرح کی مناسب چیزیں لگائیں اور زمین ہی میں ہم نے تمھارے لیے زندگی کے سامان مہیا کیے اور ان کے لیے بھی جن کے تم روزی رساں نہیں ہو۔]

۹) وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذَالِكَ دَحٰهَا ٥ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰهَا ٥ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ٥ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ٥ (النازعات:۳۳۔۳۰)

[اس کے بعد زمین بچھائی اور اس سے چشمے اور سبزہ زار نکالے اور اس پر پہاڑ کھڑے کیے۔ ان کی غرض و غایت تمھارے اور تمھارے چوپایوں کے لیے سامان معیشت مہیا کرنا ہے۔]

۱۰) وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ط (الاعراف:۱۰)

[ہم نے تم کو زمین میں اقتدار عطا کیا اور اس میں تمھارے لیے سامان معیشت فراہم کیا۔]

اس کی ربوبیت اور رسولؐ کی رحمت کی طرح فراہمی رزق کے سلسلے میں بھی قرآن کا خطاب عام عالمِ انسانیت سے ہے۔ اس میں مومن، دیندار مسلم، کافر، عورت، مرد، بوڑھا، بچہ، جوان، کالا گورا، کسی طرح کی تخصیص یا تعین نہیں ہے۔ رزق کا تعلق اسلام کی ان تعلیمات سے ہے جن میں مسلم، یا مومن سے خصوصی تخاطب نہیں ہے، اس رزق پر انسانوں کا حق ہے لیکن اس نے یہ تنبیہ بھی کر دی ہے کہ اس رزق کو شرارتوں کا پیش خیمہ نہ بناؤ۔

اللہ کی رحمت اور ربوبیت کی اہم نشانیاں اُن آیات میں ملتی ہیں جہاں قرآن نے تسخیر بحر و بر کا ذکر کیا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ط اِنَّ فِی ذَالِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ٥ (الجاثیہ ۴۵: ۱۳)

(زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب کو انسان کے لیے اللہ نے تسخیر کر دیا ہے اور جو قوم

غور و فکر کرتی ہے اس کے لیے اس میں نشانیاں ہیں۔)

اس سے انسانی ضروریات پوری کی جاتی ہیں اور رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج (آل عمران:۱۹۱) [اے ہمارے پالنے والے! تو نے یہ سب باطل و بے سود تو خلق نہیں کیا؟] کے تخلیقی سوال میں یہ بتایا کہ انھیں مایا جال نہ سمجھو۔ اسی طرح ان کی پوجا بھی نہ کرو کیوں کہ یہ تو انسان کے تابع ہیں۔ اس سے انسان پھل پھول اور اناج اگاتا ہے۔ کپاس اور اون وغیرہ سے لباس بناتا ہے۔ سر پر سائے کے لیے مٹی، گارے، پلاسٹر اور لکڑی لوہے سے مکان تعمیر کرتا ہے، نقل و حرکت کے لیے سواریاں، کشتیاں اور جہاز بناتا ہے، تجارت کا سامان تیار کراتا ہے اور اجتماعی اور انفرادی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔

وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بَارَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَا اَقْوَاتَهَا فِیْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ط سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ٥ (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۱۰)

(خدا ہی نے زمین پر پہاڑوں کی بنا ڈالی اور اُسی نے اس میں برکت عطا کی اور سامان معیشت مہیا کیا اور سب انتظام بس چار دنوں میں کیا اور (اس سامان معیشت میں) ہر طلبگار کا برابر کا حصہ ہے۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی حدیث ہے:

اُطْلُبُوا الرِّزْقَ فِی خَبَايَا الْاَرْض (اپنا رزق زمین میں چھپے ہوئے ذخیروں میں ڈھونڈو۔) (نہج الفصاحہ)

اصولِ تقسیم رزق

کائنات کے اندر جو کچھ بھی ہے اُسی کو تسخیر کر کے رزق حلال حاصل کیا جاتا ہے۔ اس لیے عطیۂ الٰہی ہے۔ پوری طرح فیض یاب ہونے کے لیے کائنات کے ذخائر

اور امکانات کو بامقصد طریقے پر تسخیر کرنا ہمارا فرض ہو جاتا ہے تاکہ فراہمی رزق کا منشائے فطرت پورا ہو۔ اس تسخیر کے لیے عمل اور فعالیت ضروری ہے۔ یہ محنت رزق کے لیے بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی اُخروی اور ابدی مسرت کے حصول کے لیے۔ ہر فرد کی رزق حاصل کرنے کی صلاحیتیں یکساں نہیں بلکہ مختلف ہیں۔ جیسے بچہ معذور ہے۔ اس کا رزق شیر مادر سے مہیا ہوتا ہے۔ اسی طرح بوڑھے اور مریض بھی رزق حاصل کرنے کے لیے سعی کرنے کی وہ صلاحیت نہیں رکھتے جو نوجوانوں، جوانوں اور صحت مندوں میں پائی جاتی ہے۔ یتیم اور اسیر، ضعیف اور فقیر کو بھی بعض حالاتِ زمانہ نے دوسروں کا دست نگر بنا دیا ہے۔ اگر کائنات کو تسخیر کرنے اور اس سے رزق حاصل کرنے کی صلاحیت مختلف افراد میں مختلف ہے تو جو جتنا حاصل کرے گا لے لے گا۔ اس میں ایک قباحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ افراد جو کم زور یا معذور و مجبور ہیں، کم پائیں گے یا بالکل ہی محروم رہ جائیں گے۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام نے رزق کی تقسیم کا بھی ایک اصول بنا دیا ہے اور بندوں تک رزق کو برابری کے ساتھ پہنچانے کا ایسا آسان طریقہ بتا دیا ہے جو اس کا اپنا ہے۔

تقسیم رزق کی اساس سورہ حٰم سجدہ میں سَوَآءً لِلسَّآئِلِیۡنَ (ہر طلبگار کے لیے برابر کا حصہ) کی اصطلاح میں بیان کی جا چکی ہے، لیکن یہ اساس مزید تشریح و توضیح چاہتی ہے تاکہ قرآن و حدیث کی روشنی میں فکر کو مناسب رہنمائی مل سکے:

۱) وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ فِى الرِّزۡقِ ۚ فَمَا الَّذِيۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّىۡ رِزۡقِهِمۡ عَلٰى مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ فَهُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ ۝ (النحل ۱۶:۷۱)

اور اللہ ہی نے تم میں سے بعض کو رزق کے معاملے میں دوسرے پر ترجیح دی ہے۔ پھر جن لوگوں کو یہ ترجیح مل گئی ہے کیا یہ انھیں (لازم) نہیں ہے کہ جن پر انھیں دسترس حاصل ہے

(غلام لونڈی وغیرہ) ان کا رزق دیں، کیونکہ روزی کے معاملے میں سب (مالک و غلام) برابر ہیں۔ تو کیا وہ لوگ خدا کی نعمت کے منکر ہیں؟

۲) مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ مِنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوۡلِ وَ لِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ۙ كَىۡ لَا يَكُوۡنَ دُوۡلَةًۢ بَيۡنَ الۡاَغۡنِيَآءِ مِنۡكُمۡ ؕ (الحشر ۲۸:۷)

[جو مال اللہ نے اپنے رسول کو گانو والوں سے بے لڑے دلوایا ہے وہ خدا اور اس کے رسول اور اس کے قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ تم میں سے جو دولت مند ہیں، دولت انھیں میں ہر پھر کے گردش نہ کرے۔]

اپنے مال کے بارے میں یہ حکم دیا گیا:

۳) وَاٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ ۙ وَالسَّآئِلِيۡنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ (البقرہ ۲:۱۷۷)

[(نیک تو وہ ہے جو) اپنا مال قرابت داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں، غریب مانگنے والوں اور کنیزوں غلاموں کو آزاد کرانے میں صرف کرے۔]

۴) وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَكُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِيۡنَ فِيۡهِ ؕ فَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَاَنۡفَقُوۡا لَهُمۡ اَجۡرٌ كَبِيۡرٌ ۝ (الحدید ۲۷:۷)

[جس مال میں خدا نے تم کو اپنا نائب بنایا ہے، اس میں سے راہِ خدا میں صرف کرو۔ تم میں سے جو ایمان لائے اور اُس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے۔]

۵) وَبِالْاَسْحَارِهُم يَسْتَغْفِرُوْنَo وَفِیْٓ اَمْوَالِهِم حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِo
(الذاریات ۲۶:۱۹_۱۸)

[اور وہ (مومن) صبح کو اللہ سے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور ان کے مالوں میں (صاحب احتیاج) مانگنے والوں اور محروموں دونوں کا معین حق ہے۔]

یہاں زکوٰۃ یا خمس یا واجب صدقات کا ذکر نہیں ہے کیوں کہ ان کا ادا کرنا تو بہر حال فرض ہے۔ ان کے علاوہ بھی مالداروں پر کچھ اور بھی مالی حقوق عائد کیے گئے ہیں۔

بعض صحابیوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی کوئی حق ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا:

۱) نعم بر الرحم اذابرت وصلة الجار المسلم فما آمن بی من بات وجاره المسلم جائع

ہاں صلہ رحمی اور ہمسائے سے حسن سلوک۔ مجھ پر وہ شخص ایمان نہیں لایا جو سیر ہو کر رات بسر کرے دراں حالے کہ اس کا ہمسایہ بھوکا ہو۔

۲) مَا آمن بی مَن بات شبعانا و جاره جائع (لئالی الاخبار)

وہ مجھ پر ایمان نہیں رکھتا جو رات کو شکم سیر سوتا ہو اور ہمسایہ بھوکا رہے۔

۶) مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ (البقرہ ۳:۲۶۱)

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اُن (کے خرچ) کی مثال اس دانے کی ہے جس سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے دو گنا بھی کر دیتا ہے۔

۷) یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ o (البقرہ ۲:۲۱۵)

(اے رسول) یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں (کن لوگوں پر) تو کہہ دو کہ جو کچھ تم نیک کمائی سے خرچ کرنا چاہو وہ ماں باپ، قرابت داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے۔ اور جو اچھا کام کرو گے اللہ اس سے ضرور واقف ہو گا۔

۸) اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلٰوتِهِمْ دَآئِمُوْنَ o وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ o لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ o (المعارج ۲۹:۲۵_۲۳)

اور وہ لوگ جو ہمیشہ اپنی نمازیں ادا کرتے رہتے ہیں اور وہ لوگ جن کے مال میں سائل کا اور محروم کا ایک معلوم حصہ ہے۔

۹) وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۔ (بنی اسرائیل: ۱۵:۲۶)

[اور قرابت والوں اور مساکین اور مسافروں کو ان کا حق دو۔]

۱۰) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ ۔ (البقرہ: ۳:۲۶۷)

[اے مومنو! تم اپنی پاک کمائی سے (راہ خدا میں) خرچ کرو۔]

۱۱) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ ۔ (البقرہ: ۳:۲۵۴)

[اے ایمان لانے والو! ہم نے تم کو جو رزق دیا ہے اس میں سے (راہ خدا میں) خرچ کرو۔]

'انفاق' کی قرآنی اصطلاح بھی مختصر تشریح کی طالب ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ،

یعنی راہِ خدا میں خرچ کرنا۔ زکوٰۃ وغیرہ سے مختلف ہے کیونکہ زکوٰۃ ایک معیّن مقدار کا
فریضہ ہے جو ہر مال میں واجب ہے۔ اس میں شخصی فیصلے یا رجحان کو دخل نہیں ہے اور نہ
اسے دینے یا نہ دینے کا اختیار۔ اس کے برعکس انفاق اختیاری ہے اس اختیار کے ساتھ
ساتھ قرآن اور سیرت کی تاکیدیں ہیں۔ یہ فریضے کے بعد کا فریضہ ہے، لیکن تاکید اتنی
شدید ہے کہ اس سے انحراف بے ضمیری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ابوسعید خدریؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ

مَن کَانَ مَعَهُ فَضل ظَهَر فلیَعُدُ بِهِ عَلَی مَن لا ظَهر لَهُ۔

(جس کے پاس قوت وطاقت کے سامان اس کی ضرورت سے زیادہ ہوں اس کو چاہیے
کہ وہ یہ فاضل سامان کمزوروں کو دیدے اور جس کے سامانِ خوردونوش ضرورت سے
زیادہ ہو اسے چاہیے کہ وہ یہ فاضل مال نادار اور حاجت مند کو دے دے۔)

اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ مال کی مختلف قسموں کا ذکر کرتے رہے۔
یہاں تک کہ سننے والوں نے یہ گمان کر لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی اپنے فاضل مال پر کوئی
حق نہیں ہے۔ اسی طرح کی ایک روایت ابوبصیرؓ سے بھی مروی ہے۔ وہ ایک دن امام
جعفر صادق کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس مجمع میں کچھ دولت مند حضرات بھی تھے۔
زکوٰۃ کا ذکر آیا تو امام نے کہا کہ زکوٰۃ پر زکوٰۃ دینے والا مدح وثنا کا مستحق نہیں ہوتا۔ یہ تو
ایک ظاہری بات ہے۔ اس کے ذریعے سے انسانی خون کی حفاظت ہوتی ہے۔ اور اس
کی بنا پر وہ مسلم کہا جاتا ہے۔ تم پر زکوٰۃ کے علاوہ بھی مالی فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ابوبصیرؓ
نے جاننے کی خواہش ظاہر کی کہ زکوٰۃ کے علاوہ اموال پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔
آپ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ خداوند عالم قرآن میں فرماتا ہے:

وَالَّذِینَ فِی اَمْوَالِهِم حَقّ مَعلُوم لِلسَّائِلِ وَالمَحرُومِ۔

رزق کی یکسانیت

تقسیم رزق کے مسئلے میں قرآن کریم نے واضح طور سے کہا ہے کہ رزق یکساں
ہے، لیکن اس کے حصول کے لیے انسان کو جدوجہد کرنا ہوگی۔ کسل مندی اور کاہلی سے
دور رہنا ہوگا ورنہ انسان اپنے یکساں حق سے محروم ہوجائے گا اور دوسرے جو اس سے
زیادہ کارمند و کارشناس ہوں گے وہ زیادہ فائدہ اُٹھالے جائیں گے۔ حقوق میں مساوات
کا مطلب لازمی طور سے حصول میں بھی مساوات نہیں ہے۔ یہ تو کوشش پر مبنی ہے۔
انسان جتنی کوشش کرتا ہے اس سے زیادہ اسے نہیں مل سکتا۔ (لَیسَ لِلاِنسَانِ اِلَّا مَا
سَعیٰ)۔ مثلاً اگر زمین برابر تقسیم بھی کر دی جائے تو ضروری نہیں کہ اس سے برابر روزی
بھی حاصل ہو۔ ایک کسان زیادہ محنت کرتا ہے، آبپاشی اچھی کرتا ہے، کھاد وغیرہ
ڈالتا ہے تو اس کے یہاں پیداوار زیادہ ہوگی کیونکہ وہ اپنے حقوق کا عمل اور علم کے ساتھ
استعمال کر رہا ہے۔ دوسرا جو یہ سب نہیں کرتا وہ پہلے کسان کے برابر روزی کیسے کما سکتا
ہے۔ زیادہ روزی کمانے والا اپنی ضرورت سے زیادہ بھی روزی کما سکتا ہے۔ سرمایہ دار
روپیہ صرف کر کے اور دوسروں کی قوتِ بازو سے خرید کر اور اجرت پر کام کرا کے یا زور
زبردستی سے زیادہ کما لیتا ہے اور جمع کرتا ہے یا استحصالی تدابیر پر صرف کرتا ہے تو اسلام
اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی اس طرح دوسروں کے حقوق پر دست اندازی کرے،
چاہے بظاہر یہ دست اندازی عام حالات کا لازمی نتیجہ ہو۔

سورہ نحل کی اکہترویں آیت میں (جو صفحات گذشتہ میں نقل کی گئی ہے) سویت
اور برابری کا ذکر آیا ہے۔ یہ برابری سویت میکانیکی نہیں ہے بلکہ اخلاقی اور سماجی انصاف
کی نظر سے اس کو قبول کر لینے، اس کو عملی جامہ پہنانے کی صورتیں بھی بتائی گئی ہیں۔ پہلے

تو سب کے لیے رزق مہیا کیا گیا۔ اب اگر زورِ بازو سے یا محنت سے یا جبر و زبردستی اور ظلم و استحصال سے کسی نے زیادہ حاصل کرلیا ہے تو اس میں سے زیردستوں کے حقوق معین کیے گئے۔ زکوٰۃ اور خُمس جیسے فلاحی ٹیکس عائد کیے گئے۔ اس کے بعد صدقات کا حکم دیا گیا۔ اس کے علاوہ مالداروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے سے زیردستوں کی مدد کریں۔ اس سلسلے کی کئی آیتیں اور حدیثیں پہلے ہی بیان کی جاچکی ہیں۔ اب مزید تفصیل بعض احادیث واقوال سے مہیا ہوگی۔ مثال کے طور پر مالک اور غلام کا حصہ کس حد تک برابر ہے اور اس پر حدیث وسنت سے روشنی ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی حدیث ہے:

اِنَّمَا هُم اِخوانَكُم فَالْبِسُوهُم مِمَّا تَلْبِسُون وَاطْعِمُوهُم مِمَّا تَطْعِمُون ٥

(وہ (غلام) تو تمھارے بھائی ہیں، جو خود پہنو انھیں بھی پہناؤ اور جو کھاؤ انھیں بھی کھلاؤ۔)

جس دن سے مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ کی یہ حدیث سنی اس دن سے ان کا یہ دستور ہوگیا کہ اپنے اور اپنے غلام کے لباس میں کوئی فرق نہ کرتے تھے۔ حضرت علی کا عمل اس سے بھی ایک قدم آگے تھا۔ وہ دو لباس خریدتے تھے اور جو بہتر ہوتا وہ اپنے خادم عنبر کو دیتے اور جو کمتر ہوتا وہ خود پہنتے۔

مشہور محدث ابن حزم ظاہری نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے:

اِنَّهُ سَمِعَ عَلى اَبُن اَبِى طَالِب يَقُولُ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ فَرَضَ عَلَى الْاَغْنِيَاءِ فِى اَمْوَالِهِم بِقَدْرِ مَايَكفِى فُقَرائِهِم فَاِن جَاعُوا وعُروَا وجَهَدوا فبمنع الاَغْنِيَاءُ حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ تَعَالىٰ يُحَاسِبَهُم يَومَ القِيٰمَةِ وَ يُعَذِّبُهُم عليهِ۔

(محلیٰ ۶:۱۵۸)

(انھوں نے حضرت علی ابن ابی طالب کو یہ فرماتے سنا کہ بے شبہ اللہ تعالیٰ نے مالداروں کے مال میں سے اتنا حصہ فرض کیا جو محتاجوں کے لیے کافی ہو۔ اب اگر وہ بھوکے ننگے اور خستہ حال نظر آتے ہیں تو اس کا سبب یہی ہوا کرتا ہے کہ سرمایہ دار اس واجب حق کو ادا

نہیں کرتے۔ اللہ اس کے لیے قیامت کے دن ان سے حساب لے گا اور ان کی کوتاہیوں پر عذاب میں مبتلا کرے گا۔)

امام جعفر صادقؑ نے مزید وضاحت کی ہے:

النّاس سواء كاسنان المشط وَالمرأ كثير بلغيه وَلَا خَير فِى صحبته من لم يرلك مثل الّذى يَرَى لِنَفسِه

(لوگ [اجتماعی حقوق میں] کنگھی کے دانوں کی طرح برابر ہیں اور ایسے افراد کی ہم نشینی مناسب نہیں جو اپنے لیے جو چاہتے ہیں وہ تیرے لیے نہیں چاہتے۔) (تحفۃ العقول)

امام رضا علیہ السلام کا قول ہے:

اَسوءِ النّاس مَعاشا مَن لَم يَعش غيرهُ فِى مَعَاشِا (تحفۃ العقول)

(اقتصادی اعتبار سے بدترین شخص وہ ہے جو اپنی آمدنی سے دوسروں کی مدد نہیں کرتا۔)

اوپر سورۂ النحل کی آیت سے تفسیر 'زبدۃ البیان' میں علامہ اردبیلیؒ نے یہ مفہوم بھی سمجھایا ہے کہ مالداروں کی طرف سے زیردستوں کو رزق میں برابر کا حصہ نہ دیے جانے کو کفرانِ نعمت قرار دیا گیا ہے۔ درجات کا یہ فرق قرآن کریم کی نظر میں ایک آزمائش ہے۔ اس نے روئے زمین پر انسان کو اپنا خلیفہ اسی لیے بنایا ہے کہ وہ منشائے الٰہی کو پورا کرتا رہے، جس کو مال کچھ زیادہ مل گیا ہے اس کو یہ امتحان اور آزمائش درپیش ہے کہ وہ اس میں سے زیردستوں، مجبوروں اور معذوروں کا حق دیتا ہے یا نہیں۔ یعنی کسی کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ جو کچھ ہے وہ دوسرے ضرورت مند کو منتقل ہوجانا چاہیے۔ اس طرح ہر شخص کو اجتماعی مساوات کے تحت اپنی ضرورت کے مطابق رزق پہنچتا رہے گا۔ یہ مستحقین اور مستضعفین کا حق ہے۔ ایسا نہ کرنے والے منشائے الٰہی کو پورا نہ کریں گے قرآنِ کریم نے اس کو واضح طور سے بیان کردیا ہے:

۱) اَهُم يَقسِمُونَ رَحمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحنُ قَسَمنَا بَينَهُم مَعِيشَتَهُم فِى الحَيٰوةِ

الدُّنیا وَرَفَعنَا بَعضَهُم فَوقَ بعضٍ دَرَجٰتٍ لِیَتَّخِذَ بَعضُهُم بَعضًا سُخرِیًّا ط
وَرَحمَتُ رَبِّكَ خَیرٌ مِّمَّا یَجمَعُونَ ٥ (الزخرف:۳۲)

کیا یہ لوگ اللہ کی رحمت کو (آپ) بانٹنے لگے ہیں؟ (حالانکہ) ان کی دنیاوی زندگی میں ان کی معیشت ان لوگوں کے درمیان ہم نے بانٹ ہی دی ہے۔ ہم نے ایک کو دوسرے پر درجوں کے اعتبار سے بلند کیا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کی خدمت کر سکیں۔ اور جو لوگ یہ مال و دولت جمع کر رہے ہیں اس سے کہیں بہتر اللہ کی رحمت ہے۔

۲) اَللّٰهُ یَبسُطُ الرِّزقَ لِمَن یَّشَاءُ وَیَقدِرُ ط وَ فَرِحُوا بِالحَیٰوةِ الدُّنیَا ط
وَمَاالحَیٰوةُ الدُّنیَا فِی الاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ٥ (الرعد:۲۶)

[اللہ جس کو چاہے اس کے رزق میں کشادگی دے اور جس کو چاہے ایک محدود پیمانے کی تنگی میں ڈالے اور انھیں اس دنیا کی زندگی سے بڑی خوشی ہوتی ہے، لیکن آخرت میں دنیا کی زندگی کی حیثیت کیا ہے؟ بس ایک متاع ہی ہے۔]

۳) وَهُوَالَّذِی جَعَلَکُم خَلٰٓئِفَ الاَرضِ وَ رَفَعَ بَعضَکُم فَوقَ بَعضٍ
دَرَجَاتٍ لِّیَبلُوَکُم فِی مَآ اٰتَاکُم ط (الانعام:۱۶۵)

[اور وہی ہے جس نے زمین میں تمھیں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر درجے دیے تاکہ جو کچھ تمھیں دیا ہے اس میں تمھیں آزمالے۔]

۴) وَیَسئَلُونَکَ مَاذَا یُنفِقُونَ ط قُلِ العَفوَ ط (البقرہ:۲۱۹)

[(اے رسول) لوگ تم سے پوچھتے ہیں (راہِ خدا میں) کیا خرچ کریں تو کہہ دو کہ جو کچھ تمھاری ضرورت سے بچے۔]

۵) وَیُؤثِرُونَ عَلٰٓی اَنفُسِهِم وَلَو کَانَ بِهِم خَصَاصَةٌ ط وَ مَن یُّوقَ شُحَّ نَفسِهٖ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ المُفلِحُونَ ٥ (الحشر:۹)

[اگرچہ انھیں ذاتی حاجتوں میں تنگی ہی کیوں نہ ہو، لیکن وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اور جو لوگ اپنے نفس کو حرص سے بچالے گئے وہی اپنی دلی مراد پائیں گے۔]

اسلامی سویّت یہ ہے کہ ضروریاتِ زندگی کے پورا ہونے میں برابری ہو۔ اگر تقسیم رزق نابرابر ہو تو جس کے پاس مال زیادہ ہو وہ صاحبانِ احتیاج کی حاجت روائی کے لیے اپنے زائد مال کو وقف سمجھ لے اور زیردستوں کی ہر طرح کی مدد و اعانت ان کا حق سمجھ کے کرے۔ اصول مساوات تقسیم کے بارے میں حضرت علیؑ کا ایک قول گذشتہ صفحات میں نقل ہو چکا ہے۔ اس بحث کے خاتمے پر ان کے دورِ خلافت کی ایک تقریر کا اقتباس بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جب حضرت نے طریق نبوی پر عمل کرتے ہوئے تقسیم اصول سویہ اختیار کیا تو بعض ذی اثر حلقوں سے اس کی تبدیلی کی خواہش کی گئی۔ اس پر آپ نے فرمایا:

اتامرونی انی اطلب النصر بالجور فِی مَن وُلیت علیه وَاللّٰه لاأطور به مَاسمر سمیر و ما اَمّ نجم فی السَّماء نجما لوکان المال لی لسویّت بَینَهُم فکیفَ وانماالمال مال اللّٰه اَلّا و ان اعطاء المال فی غیر حقه تبذیر و اسراف وهو یرفع صاحبه فی الدنیا وَیَضعه فی الاٰخرة۔ (نہج البلاغہ: خطبہ:۱۲۶)

[کیا مجھے تم یہ حکم دینا چاہتے ہو کہ میں تمھاری مدد حاصل کرنے کے لیے ان پر ظلم و جور کروں (یعنی ان کا حق ماروں) جن کا میں والی بنایا گیا ہوں؟ خدا کی قسم! جب تک راتوں کے قصے اور افسانے باقی ہیں، ایک ستارہ دوسرے ستارے کے پیچھے چل رہا ہے،

میں اس طریقے کے پیچھے نہیں جاؤں گا۔ اگر یہ میرا ذاتی مال ہوتا تو بھی لوگوں پر برابر ہی تقسیم کرتا اور جبکہ وہ اللہ کا مال ہے تو کیسے مساوات کا خیال نہ رکھوں؟ ہاں، سمجھ لو! استحقاق کے بغیر مال کی بخشش و فیاضی، فضول خرچی اور اسرافِ بے جا ہے، جو برتنے والے کو دنیا میں بلند کرسکتا ہے لیکن آخرت میں پست و ذلیل کرتا ہے۔]

محنت اور مشقت میں بھی برابری

ہر ایک کو اس کی احتیاج کے مطابق روزی فراہم کرنے کے انتظامات کرنے کے ساتھ ساتھ، یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ ہر فرد محنت و مشقت کرے اور حصول رزق کی کوششوں میں لگا رہے۔ یہ نہ ہو کہ رزق کی فراہمی پر بھروسا کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جائے یا سوال کرنے، قرض لینے اور دریوزہ گری کو پیشہ بنالے۔ سوال اور طلبِ حوائج کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ اور ائمہ ہدیٰ نے ہمیشہ بُرا کہا ہے۔ امام زین العابدینؑ نے ارشاد کیا ہے:

طلبُ الحوائج الی الناس مذلة لِلحَیَاة ومذهبة لِلحَیاء واستخفاف بالوقار وهُوَ الفقر الحاضر (تحفۃ العقول:۲۰۱)

(زندگی میں کسی سے التجا کرنا ذلت ہے، غارت گرِ حیا ہے۔ انسانی وقار، شخصیت اور فقر کو سبک کرنا ہے، کیونکہ آدمی اپنے ہی ہاتھوں ذلیل ہوتا ہے۔)

امام رضا کا قول ہے:

اِعمَل لِدنیاك كانك تعیش ابداً وَاِعمَل لِاٰخِرَتُك تموت غداً

(دنیا کے لیے اس طرح جدوجہد کرتے رہو جیسے تمھیں قیامت تک رہنا ہے، لیکن آخرت کے لیے اس طرح عمل کرو جیسے کل مرنے والے ہو۔)

قرض کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے ایک جملے میں یہ سمجھا دیا ہے کہ قرض لینے سے انسان کے معنوی استقلال پر ضرب پڑتی ہے:

ایّاکُم والدَین فانه شین لِلدَین وهم باللّیل و ذل بالنهار

(حتی الوسع قرض نہ لو کیونکہ یہ دین کے چہرے پر بدنما داغ ہے۔ راتوں میں قرض کا غم کھائے جاتا ہے اور دن میں یہ موجب ذلت ہوتا ہے۔)

قرآن میں یہ نظریاتی اشارہ ملتا ہے کہ هُوَ اِنشأکم منَ الارض واستعمرکم فیه ا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ اللہ نے انسان کو زمین پر اس لیے بسایا کہ وہ اسے آباد کرے، تاکہ اس میں پیدا ہونے والے غلّے اور پھل وغیرہ اس کے اسباب معیشت بن سکیں۔ اس اشارے میں بھی مسلسل پیغام عمل موجود ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ اور ائمہ و اصحابؓ کے فرمودات سے اس کی مزید توثیق وتصدیق ہوتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ قرآنی اعلان ہے کہ انسان کو جو کچھ اس کی محنت سے ملا ہے، بس وہی اس کا ہے۔ لَیسَ لِلْاِنسانِ اِلّا مَا سَعیٰ

جو کچھ ذاتی محنت سے حاصل ہوتا ہے وہ تو اس کا ہے ہی، لیکن اگر یہ اس کی ضروریات کو کافی نہیں ہوتا تو بیت المال سے وہ ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں اور زیادہ مالدار طبقے پر یہ لازم قرار دیا جاتا ہے کہ خاص اور عام حقداروں کی مدد کریں۔ اس طرح دولت کسی ایک جگہ بے سبب جمع نہیں ہونے پاتی اور مسلسل گردش میں رہ کر ایک دوسرے کی مدد کر کے ایک طرح کی سوسائٹی ضرور یہ وجود میں لانے کا سبب بنتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس نظام پر عمل کرنے میں کوتاہیاں ہوئیں لیکن بنیادی طور پر یہ نظام ایک نئی ترقی پسندانہ ماحول اور مستقبل اپنے ساتھ ضرور لایا۔

''تہذیب الاحکام'' میں حاجت مندوں کو آٹھ اقسام میں بانٹا گیا ہے اور زکوٰۃ سے حاصل شدہ مال سے ہر قسم کے لیے رزق مقرر کیا گیا۔ ان تمام حاجتمندوں میں کوئی ایسا باقی نہ رہا جس کے لیے حصہ مقرر نہ کر دیا گیا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے قرابت داروں کے لیے خمس کے مال میں آدھا حصہ مقرر ہوا اور اس طرح وہ عوام الناس کے صدقات سے بے نیاز کر دیے گئے۔ اب نہ عام فقیروں میں کوئی فقیر رہ گیا اور نہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کے قرابت داروں میں کوئی محتاج رہ گیا جن کی ضروری حاجتیں پوری نہ کر دی گئی ہوں۔ ایک حدیث میں یہی بات یوں کہی گئی ہے:

ان اللّٰہ لم یترک شیئا من صدوف الاموال الا وقد قسمه واعطی کل ذی حق حقه الخاصة والعامة والفقراء والمساکین و کل ضرب من صفوف الناس.

(خدا نے کسی قسم کے مال کو تقسیم کے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ خواص وعوام، فقرا و مساکین اور ہر طبقے کے لوگوں میں جس کا جو حق تھا اس کو عطا کر دیا گیا۔) [1]

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستان میں اصلاح اراضیات کے قوانین وضع ہونا شروع ہوئے۔ اس وقت بعض ناواقف اہلِ اسلام نے بھی ان کی مخالفت کی۔ انھیں شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سلسلے میں ترقی پسندی کے بیج پہلے پہل اسلام نے ہی بوئے تھے اور یہ بات یاد رہے کہ تیرہ سو برس پہلے کی ہے۔ کتاب ''مکاسب'' میں زمین کے بارے میں اور اس کی ملکیت کے سلسلے میں تفصیل سے لکھا ہے کہ زمین یا تو موات (بنجر، غیر آباد پرتی) ہوگی یا آباد، عامرہ۔ یہ دونوں وصف اس کے اصلی ہیں یا عارض ہوتے ہیں۔ اس طرح زمین کی کل چار قسمیں ہوئیں۔

۱) پہلی قسم اس زمین کی ہے جو اصلاً بنجر (موات) ہو اور وہ آباد ہونے کے بعد مردہ نہ ہوئی ہو۔ یعنی ابتدا سے بنجر اور ویران اور کسی کی مملوکہ ومقبوضہ نہ ہو۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ

[1] اسلام کا معاشی نظام: علامہ سید محمد رضی زنگی پوری: ۹:۱۷۶ (اکرم حسین الکٹرک مشین پریس وارانسی، ۱۳۸۸ھ) طبع ثانی

یہ ہے کہ ''موتات، دراصل خدا، رسول کی ملکیت ہے، پھر اے مسلمانو! وہ تمھارے لیے ہے۔ اسلامی قانون کے ماتحت اس کو معاوضہ دیے بغیر مزروعہ بنایا جا سکتا ہے۔'' لیکن ایک حدیث میں یہ وضاحت ہوگئی ہے کہ مسلمان ہی نہیں جو قوم بھی بنجر زمین کو آباد کرے گی وہ اسی کی ہو جائے گی۔

۲) دوسری قسم زمین کی وہ ہے جو اصلاً عامرہ (آباد) ہو۔ یعنی کسی کے آباد کیے بغیر قدرتی طور پر آباد ہو۔ یہ بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وامامؑ کی ملکیت ہوگی۔ اس پر قبضہ کرنے اور اپنی نگرانی اور 'حیازہ' میں لے لینے کی اجازت بھی عام ہے۔

۳) تیسری قسم وہ بنجر زمین ہے جو بعد میں آباد ہوئی، وہ اس شخص کی ملک ہوگی جس نے اسے آباد کیا مگر شرطوں کے ساتھ۔

۴) چوتھی قسم زمین وہ ہے جو آباد رہنے کے بعد بنجر اور پرتی ہوگئی ہو۔ اگر زمین کی آبادی اصلی ہے تو اللہ و رسول و امام کی ہوگی اور اگر کسی دوسرے آباد کار کی محنت کا نتیجہ ہو تو اس کے بارے میں اختلاف رائے ہے کہ وہ پہلے آباد کار کی ملکیت پر باقی رہے گی یا اس کی ملکیت سے نکل کر دوسرے آباد کار کی ملکیت ہو جائے گی۔

اسلامی قانون نے یہ بھی وضاحت کی کہ مفتوحہ علاقوں اور ملکوں میں بھی آراضیات کاشتکاروں کے قبضے میں چھوڑ دی جائیں گی اور صرف ان سے خراج کی ایک رقم یا پیداوار کا ایک حصہ بطور لگان لے سکیں گے، لیکن یہ بندوبست ان کاشتکاروں کی قوت برداشت سے باہر نہ ہونے پائے۔ ان کا یہ حق خریدا اور بیچا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن اس زمین کے ایسے آثار جیسے درخت مکان وغیرہ بیچے نہیں جا سکتے۔ صرف آراضی سے حقِ انتفاع خریدا بیچا جا سکتا ہے۔ خراج کے لیے کوئی قدر معین تو نہیں ہے لیکن اس کی تعیین بادشاہ اور کاشتکاروں کی رضامندی چاہتی ہے۔[1] گویا اسلام کا یہ منشا نہیں ہے کہ حاکم وقت خراج

[1] مکاسب : ۷۷

اور لگان کے معاملے میں من مانی کرے اور زبردستی کوئی رقم مقرر کردے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان کی برطانوی حکومت بندوبست کے سلسلے میں من مانے طور پر مال گزاری اور لگان مقرر کردیا کرتی تھی اور اس کی دادفریاد نہیں تھی۔ عرب نے سیکڑوں برس پہلے کہیں بہتر طریقہ رائج کیا تھا۔

بیگار اور سختی کی ممانعت

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کو کسانوں اور مزدوروں سے خاص ہمدردی تھی۔ وفات کے وقت آپ نے حضرت علی علیہ السلام سے وصیت فرمائی تھی کہ تمھارے ہوتے ہوئے کسانوں پر ظلم نہ ہونے پائے اور نہ زمین کا مقررہ لگان بڑھایا جائے اور نہ کسی مسلم اجیر سے بیگار لی جائے۔[1] 'وسائل' ہی میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنے افسروں کو کئی بار یہ فرمان بھیجے کہ مسلمانوں سے بیگار نہ لی جائے۔ غیر مسلم کاشتکاروں سے بھی معاوضے کے بغیر خدمت یعنی بیگار لینے کی ممانعت تھی۔ حضرت علیؑ کاشتکاروں سے خطاب فرمایا کرتے تھے کہ تم سے واجب الادا لگان کے علاوہ جو کچھ بھی مانگا جائے وہ ظلم و زیادتی ہے تم ہرگز نہ دینا۔ عمال حکومت کے نام اپنے فرامین میں لکھا کرتے تھے کہ کسانوں سے عمدہ سلوک کیا جائے۔ خراج کی وصولی میں سختی اور جبر کرنا ممنوع تھا۔ غرض جو بدعنوانیاں دوسرے ملکوں اور معاشروں میں سیکڑوں برس بعد تک جاگیردارانہ نظاموں کی خاص نشانیاں بنی ہوئی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ اور ان کے جانشینوں نے اپنے دور میں ان کو مٹا کے رکھ دیا تھا۔ یہ اس منصفانہ نظام کی کارفرمائیاں تھیں کہ سارا معاشرہ ایک ترقی پسند راستے پر چل پڑا تھا جس میں انسان کو پہلی

۱۔ وسائل

بار اس کی شخصیت واپس ملی تھی اور اس نے سماج میں عزت کی جگہ پائی تھی۔

کسل اور آرام پسندی

وسائل زندگی مہیا کردینے کے علاوہ اسلام نے یہ بھی کوشش کی کہ نئے اقدامات نے جو بہتر صورتِ حال پیدا کردی ہے اس میں استحکام اور پائیداری پیدا ہو اور لوگ امن اور چین کی زندگی میں رہ کر سماجی خطرات کو بھول نہ جائیں۔ معاشرے کو صلاح و فلاح کے راستے پر لے چلنے کے لیے مستقل طور سے ہوش مندی اور احتیاطی تدابیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی دور بین نگاہوں نے اس خطرے کو محسوس کرلیا تھا کہ خوشحالی اور امن کے دور میں مسلمان کہیں محنت ومشقت کا سبق بھول کر آرام طلبی، عیاشی اور کسل مندی میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ چنانچہ شروع ہی سے اس کے انسداد کی کوشش کی گئی۔ جب دوسروں کی کمزوری یا حاجات کی زیادتی کے باعث زیادہ پانے والوں پر یہ لازم قرار دیا گیا کہ وہ حاجت مندوں کی کفالت کا بندوبست کریں تو یہ امکان اور خطرہ بھی پیدا ہوا کہ آرام پسند طبیعتیں محنت ومشقت سے گریز نہ کرنے لگیں اور سوال کو وظیفہ و وطیرہ نہ بنالیں۔ جیسے رزق میں استحصالی انداز کی نابرابری مردود قرار پائی ویسے ہی روزی حاصل کرنے میں کاہلی اور سوال کرنے کی عادت کو بھی بُرا مانا گیا۔ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی حدیثیں خاص اہمیت رکھتی ہیں:

۱) لا تکسَل عَن مَعیشَتِکَ فَتَکُون کلًّا علیٰ غیرک

(روزی کمانے میں کسل اور کاہلی نہ کرو کیونکہ اس طرح تم دوسروں پر بوجھ بن جاؤگے۔)

۲) مسئلةُ النّاس مِن الفَواحِش
(لوگوں سے سوال کرنا بدکاریوں میں داخل ہے۔)

۳) مَلعُونٌ مَن اَلقیٰ کَلَّهٗ عَلَی النّاس (وافی ۲:۷)
(جس نے اپنا بوجھ دوسرے پر ڈال دیا وہ ملعون ہے۔)
سید قطب نے اپنی کتاب العدالة الأجتماعيه میں حضرت علی کا یہ قول نقل کیا ہے:

اِنَّ اللّٰه یُحِبُّ العَبْدَ المحترف
(یقیناً اللہ پیشہ ور بندے کو دوست رکھتا ہے۔)
امام موسیٰ کاظم نے کہا ہے کہ:

اِیاك والكسل و الضجر فاِنّهما یَمنعانك حظّك مِن الدنیا والاخره (نفس المصدر:۳۵۱)
اور کسل مندی اور تنگ دلی یہ دونوں باتیں تجھے دنیا اور آخرت میں سے کسی سے بھی لطف نہ اُٹھانے دیں گی۔
امام جعفر صادق کے اقوال ہیں:

۱) اَوجَبَ اللّٰهُ لِعِبَادِهٖ اَنْ یَطْلَبوا مِنهُ مَقَاصِدهُم بِالاَسبَابِ الَّتی سَبَّبَهَا لِذالِكَ وَامرهُم بِذالِك (جامع السعادات:۵۳۴)
(اللہ نے بندوں پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ اپنے مقصدوں کو ان اسباب کے ذریعے سے حاصل کریں جو اللہ نے ایسے مقاصد کے لیے مہیا کیے ہیں اور اللہ نے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے۔)

۲) انی لأحبّ ان اری الرجل محترفاً فی طلب الرزق .
[میں یقینی طور سے اس بات کو دوست رکھتا ہوں کہ میں کسی کو طلب رزق میں کوئی پیشہ اختیار کرتے ہوئے دیکھوں۔] (وافی منقول از من لایحضرہ الفقیہ :۳:۷)

ہر شخص کا محنت کر کے اپنے لیے کسی پیشے اور کام سے رزق پیدا کرنا ہی مناسب سمجھا گیا ہے اور سوال کو علی العموم صرف اس وقت جائز مانا گیا ہے جب اس کے بغیر چارۂ کار نہ رہ جائے اور سوال کرنے والا واقعتاً مجبور و معذور ہو۔ کسل مندی سوالی کے لیے بھی بُری ہے اور صاحبان اقتدار و علم و فضل کے لیے بھی۔ کاہلی کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی معذور ہے تو اس کی معذوری کو ہم کاہلی نہیں کہہ سکیں گے۔ کاہلی دراصل کام کرنے کی صلاحیت ہوتے ہوئے سستی برتنے، آرام کرنے اور کام سے منہ موڑنے کو کہتے ہیں۔ یہ یا تو پیشہ ور فقیروں میں دیکھنے میں آتی ہے یا پھر ایسے امیروں اور مالداروں میں جو اس کو کوئی اچھی بات سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں ہی صورتیں دولت کی پیداوار میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ اس لیے دونوں ہی مذموم ہیں اور اسلام نے دونوں کی مذمت کی ہے۔ جیسے توبہ میں ان یہودیوں اور عیسائی عالموں اور زاہدوں کی بُرائی کی گئی ہے جو دوسروں کے مال پر اپنی زندگی کی بساط بچھاتے ہیں۔

رزقِ حلال

اصولی طور پر رزق اللہ کی طرف سے ہے۔ کچھ تو ہوا، پانی، زمین کی طرح عام ہے اور کچھ کا انحصار قوت بازو پر ہے۔ قوت بازو سے کمائے ہوئے مال پر کمانے والے کا حق ہے، لیکن اسلام نے یہاں ایک اخلاقی سوال اٹھایا ہے کہ یہ مال و دولت کس طرح حاصل کی گئی ہے۔ دوسروں کا حق ہڑپ کر کے، دوسروں کے مال میں خیانت کر کے،

لوٹ مار اور فتنہ و فساد برپا کر کے، بیواؤں، یتیموں اور زیر دستوں کے مال کو چھین کے، تباہ کن سود لے کے، ذخیرہ اندوزی کر کے اور عوام کو ستا کے جو دولت حاصل کی گئی یا دوسرے حرام ذرائع سے ملی ہو، وہ اسلام کے نزدیک ناجائز ہے۔ اسلام کی نظر میں معاش کے حصول کے لیے اچھے اور خدا کے پسندیدہ ذرائع اور طریقے ہی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

اگر دولت کی پیداوار میں اچھائی کا خیال نہیں رکھا گیا تو تقسیم بھی اچھی نہیں ہوگی اور انصاف پسندانہ نظام قائم نہ ہو پائے گا۔ یہاں اس بحث کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے جو مقصد اور ذرائع کے بارے میں مدتوں سے جاری ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اگر مقصد صحیح ہو تو ہر ذریعہ صحیح ہو جاتا ہے۔ یعنی مقصد ذرائع کا جواز بن جاتا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ذرائع بھی مقصد کے تحت آتے ہیں۔ اگر ذریعہ فاسد ہوگا تو مقصد صالح نہیں ہوسکتا۔ اگر اعلیٰ تر مقصد کے لیے ایسا ذریعہ استعمال کرلیا جائے جو عام طور پر پسندیدہ نہیں ہے، لیکن جس کے استعمال کے بغیر اعلیٰ تر اور صالح مقصد حاصل نہیں ہوسکتا تو وہ ذریعہ جائز بن سکتا ہے، لیکن یہ اضافی امر ہے۔ مثلاً اصل اصول کی حفاظت کے لیے جنگ کی اجازت ہے لیکن مطلق جنگ کی نہیں ہے۔ لیکن بے گناہ کا قتل کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہے اور مقصد کی بلندی اس مطلق ناپسندیدہ امر کو جائز ذریعہ حصول مقصد نہیں بنا سکتی۔

اس ضمنی بحث سے قطع نظر اسلام کا یہ نظریہ صاف و صریح ہے کہ رزق کا حصول صالح اور جائز طریقوں سے ہی ہونا چاہیے۔ قرآنِ کریم نے صرف حلال و طیب و پاک ذرائع کے استعمال کی اجازت دی ہے اور باطل اور غلط طریقوں کے استعمال سے بار بار روکا ہے۔ یہاں چند آیات نقل کی جاتی ہیں:

۱) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (البقرۃ:۱۶۸)

(اے لوگو! زمین میں جو کچھ ہے اس میں سے حلال اور پاک چیزیں کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔)

۲) يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝
(المؤمنون:۵۱)

(اے پیغمبرو! تم پاک چیزوں میں سے (جو چاہو) کھاؤ اور نیک کام کرو۔ بیشک تم جو کچھ کرتے ہو اسے میں جانتا ہوں۔)

۳) وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ص (المآئدہ: ۸۸)

(اللہ نے تمھیں جو رزق دیا ہے اس میں سے حلال اور طیب کھاؤ۔)

۴) اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (المآئدہ:۹۰)

[یقیناً شراب، جُوا، بُت اور پانسے ناپاک کارِ شیطان ہیں۔ اس لیے ان سے پرہیز کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔]

۵) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۛ (النسآء:۲۹)

(اے ایمان والو! آپس میں کسی کا مال باطل (ناجائز) طور پر نہ کھاؤ۔ ہاں، آپس کی رضامندی سے تجارت ہو تو مضائقہ نہیں۔)

٦) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ (البقرہ:۲۶۷)

(اے ایمان لانے والو! اپنی پاک کمائی اور جو چیزیں ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالی ہیں ان میں سے راہِ خدا میں خرچ کرو اور بُری چیز کو (نیک کے سلسلے میں) خرچ کا قصد بھی نہ کرو۔ اگر چہ تم کو کوئی ایسی چیز دینا چاہے تو تم لینے والے نہیں، لیکن تم اس سے جان بوجھ کر آنکھیں چراؤ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز اور سزاوارِ حمد ہے۔

یہ بھی صراحت کردی گئی ہے کہ راہِ خدا میں خرچ کر کے نیکی کمانے کے لیے ضروری ہے کہ وہی چیزیں خرچ کی جائیں جو ہمیں عزیز ہیں۔ نہ وہ کہ جنھیں ہم خود پسند نہیں کرتے اور اپنے پاس سے یوں بھی الگ کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں اس طرح کا خرچ نیکی نہیں خرید سکتا۔ سورۂ نسا میں صاف اعلان ہے:

٧) لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ (آلِ عمران:۹۲)

(جب تک تم ان چیزوں میں سے جن سے تمھیں محبت ہے خرچ نہ کرو گے، ہرگز نیکی کا درجہ نہیں پا سکتے۔)

٨) وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ (البقرہ:۲۷۵)

(اللہ نے خرید و فروخت کے معاملات حلال اور تباہ کن سود خوری کو حرام قرار دیا ہے۔)

مختصر یہ کہ اپنا رزق بھی حلال اور پاک ہو اور جو دوسرے کو امداد کے طور پر دیا جائے وہ بھی۔ یہ مال ایسا نہ ہو جو ناپسندیدہ اور بارِ طبع ہو اور اس مال کا مالک اسے کسی طرح اپنے سے الگ ہی کردینا چاہتا ہو۔

عرب کے اقتصادی ارتقا کے اس ابتدائی دور میں کلّی برابری تو نہیں مگر یکسانی پیدا کرنے کے لیے اسلام نے کئی اور قوانین بھی وضع کیے، ان میں مال جمع کرنے کے خلاف جدوجہد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

جمع مال کی مخالفت

مال جمع کرنے اور ذخیرہ اندوزی کے خلاف خاصا مواد قرآن اور احادیث دونوں میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں ایک پورا نظام زکوٰۃ، خمس اور صدقات کا ہے تا کہ دولت چند انسانوں میں مرکوز ہو کر نہ رہ جائے بلکہ گردش کرتی رہے۔ اس کے علاوہ صاحبانِ مال پر زیردستوں، کمزوروں، قرابت داروں، ہمسایوں، مسافروں وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی لازم قرار دی گئی۔ اس کا بھی مقصد یہی تھا۔ رزق میں یکسانی لانے کا یہ ابتدائی طریقہ بنیادی اسلامی مساوات کا اہم سنگِ میل ہے۔ جمع مال کے خلاف قرآن مجید میں واضح ارشادات موجود ہیں:

١) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (التوبہ: ۳۴)

(اے ایمان والو! اس میں شک نہیں کہ (یہود و نصاریٰ) کے بہتیرے عالم اور راہب لوگوں کا غلط طریقے سے حاصل کیا ہوا مال بے استحقاق کے چکھ جاتے اور اللہ کا راستہ روکتے ہیں اور چاندی اور سونے کو جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان سب کو (اے رسول) دردناک عذاب کی خبر سنادو۔)

۲) وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ o الَّذِىۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ o يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ o (الھمزہ: ۱۔۳)

(ہر طعنہ دینے والے چغل خور کی خرابی ہے جو مال جمع کرتا اور گن گن کر رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ باقی رہے گا۔)

۳) وَ الَّذِيۡنَ يَكۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَالۡفِضَّةَ وَلَا يُنۡفِقُوۡنَهَا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ o يَّوۡمَ يُحۡمٰى عَلَيۡهَا فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكۡوٰى بِهَا جِبَاهُهُمۡ وَجُنُوۡبُهُمۡ وَظُهُوۡرُهُمۡ ؕ هٰذَا مَا كَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَكۡنِزُوۡنَ o (التوبہ: ۳۴۔۳۵)

(جو لوگ سونے اور چاندی کے ذخیرے جمع کرتے ہیں اور ان کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، (اے رسول) ان کو خوفناک عذاب کی خبر سنا دو۔ جس دن وہ سونا چاندی جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانی، پہلووں، پٹھوں پر داغ لگائے جائیں گے اور (ان سے کہا جائے گا) یہ وہ ہے جسے تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا۔ اپنے جمع کیے ہوئے خزانے کا مزا چکھو۔)

جمع مال کی طرح ذخیرہ اندوزی اور احتکار کو بھی منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے بے جا نفع اندوزی کی راہ کھلتی ہے اور عوام کی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ 'احتکار' غلّے کی ذخیرہ اندوزی کو کہتے ہیں، تاکہ فروخت روک کر مہنگائی بڑھائی جائے اور مہنگا ہونے پر ذخیرہ کیا ہوا مال بیچا جائے، اس کی ممانعت کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے ذخیرہ اندوز پر لعنت کی ہے اور ایک حدیث میں فرمایا ہے:

ایما رجل اشتری طعاما فحسبه اربعین صباحاً یزیدبه الغلاء لِلمسلمین ثُمّ باعه و تصدق بِثمنه لم یکن کفارة لما صنع۔

(جس نے کھانے کا سامان خریدا اور اس کو چالیس دن اس لیے روک رکھا کہ مسلمانوں کے ہاتھ گراں قیمت پر فروخت کرے۔ پھر اس نے فروخت کے بعد اس کی قیمت محتاجوں پر تصدق کی تو یہ تصدق اس کے بُرے کرتوتوں کا کفارہ نہ ہوگا۔)

۴) مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ مِنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ وَلِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ۙ كَىۡ لَا يَكُوۡنَ دُوۡلَةًۢ بَيۡنَ الۡاَغۡنِيَآءِ مِنۡكُمۡ ؕ وَمَاۤ اٰتٰٮكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ ۚ وَمَا نَهٰٮكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ o (الحشر: ۷)

(اور فے (جو کچھ جنگجویوں سے بے لڑے بھڑے مل جائے) جو اللہ نے رسول کو دلوائی قریہ والوں سے پس وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ ان میں جو مالدار لوگ ہیں، انھیں میں دولت گردش نہ کرتی رہ جائے۔ اس لیے رسول تمھیں اس میں سے جو کچھ دے، لے لو اور جس سے منع کریں اس سے کنارہ کشی کرو۔ اور اللہ سے ڈرو اور اس میں شک نہیں کہ نتائج کے معاملے میں اللہ بہت ہی سخت ہے۔)

۵) وَاَنۡفِقُوۡا مِنۡ مَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ ۔ (المنافقون: ۱۰)

(اور ہم نے تمھیں رزق عطا کیا ہے اس کو خرچ کردو (اس کی راہ میں) قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آ گھیرے۔)

تقسیم بالسّویہ کی نوعیت

گذشتہ اوراق کی تفصیلات سے ایک تصویر ابھرنے لگی ہے جو خاصی واضح ہے۔ اس میں اخلاقی اور اقتصادی دونوں پہلو سامنے لائے گئے ہیں اور اسلامی مساوات

کی گفتگو کرتے وقت ان میں سے کسی ایک کو نظر انداز یا اس کی حیثیت کو گھٹانا مناسب نہ ہوگا کیونکہ یہ ایک مکمل تصور ہے اور اسے اسی شکل میں دیکھنا چاہیے۔ مختصر طور سے اس کے اجزائے ترکیبی کچھ اس طرح پر ترکیب پائیں گے کہ یہ سویّت یا برابری جو اسلامی تقسیم کی بنیاد ہے اس میں رزق حلال وطیب ہو، دوسروں پر جبر وظلم یا بے ایمانی اور دغل سے نہ لیا گیا ہو، بلکہ محنت اور عمل کے ذریعے حاصل کیا گیا ہو۔ ایسے کاموں سے پرہیز ہو جن سے سماج میں فساد اور بُرائیاں پھیلتی ہوں۔ مثلاً سود یا جسم فروشی وغیرہ۔ اس رزق صالح اور طیب سے ضرورت بھر خود حاصل کرنے کے بعد جو بچے وہ مستحقین کو دیدے۔ اس طرح کے رزق میں بڑے چھوٹے کا فرق نہیں ہے۔ جہاں پیداوار اور اس کے صرف کی نوعیت یکساں ہو اور جہاں ضروریات زندگی کے اہم عناصر مثلاً غذا، مکان وغیرہ کی فراہمی کا سوال ہو، وہاں مساوات اسلامی کا اطلاق ہوگا۔ ایسے مواقع پر مساوات برتنا اور قیام مساوات کی طرف قدم اُٹھانا عین تعلیماتِ اسلامی کے مطابق ہوگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے غلاموں کو بھائی کا مرتبہ دے کر سویّت اور برابری کے اسی پہلو کو نمایاں کیا تھا۔ یہ اقلیدسی نہیں بلکہ بنیادی اخلاقی اور انسانی برابری کا تصور تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ سویّت تھی جو ضروریات اور محنت کے اعتبار سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ واضح بات ہے کہ سماج میں فرد فرد کی ضرورتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ کسی کا کنبہ چھوٹا ہے، کسی کا بڑا، کسی کے بچے تعلیم پا رہے ہیں کسی کے بچے روزگار پا چکے ہیں۔ کسی پر ماں باپ کا بھی بار ہے، کسی پر نہیں ہے۔ کسی کو پیشے ضروریات کے اعتبار سے کچھ زیادہ چاہیے، کوئی مریض ہے، کوئی بے گھر ہے، کسی کو محنت جسمانی کرنا پڑتی ہے، کوئی فوجی خدمات انجام دیتا ہے، کسی کو سائنسی تجربات کے لیے آلاتِ تجربہ خریدنے کی ضرورت ہے، کسی مصنف کو کتابوں کی حاجت ہے۔ اس لیے ایسے معاشرے میں جہاں معاشرہ خود یہ ذمہ داری اپنے سر نہیں لیتا کہ وہ ہر فرد کی ضرورتیں فراہم کرے گا، افراد کے لیے سامانِ معیشت فراہم کرنے کی خاطر کم یا زیادہ

مال اور سامان کی فراہمی لازمی قرار پائے گی۔ یہی فرض صاحبان حیثیت افراد پر عائد کیا گیا ہے اور بعض صورتوں میں خود بیت المال نے یہ ذمہ داری سنبھالی ہے۔

اسلام کے اس ابتدائی دور میں جب اس کے اساسی اور بنیادی قوانین مرتب ہو رہے تھے، سماجی اقتصادیات اتنے پیچیدہ نہیں تھے جتنے آج ہیں۔ عرب میں پیداوار ویسے بھی کم تھی اور جو تھوڑی بہت ہوتی بھی تھی وہ عام ضروریات کو کافی نہیں تھی۔ زیادہ محنت کے کاموں میں عرب کی طبیعت بھی کم لگتی تھی۔ مثلاً جس پیمانے پر کھیتی باڑی کی جاسکتی تھی، نہیں ہو رہی تھی اور لوگ تھوڑی محنت کر کے زیادہ منافع کی فکر میں رہتے تھے۔ اس میں انھیں سب سے آسان لوٹ مار نظر آتا تھا۔ پھر تجارت میں کم تول ناپ کرنا یا سود کا کاروبار کرنا ایسے ذرائع تھے جن سے آمدنی جلد بڑھ سکتی تھی۔ جوئے کا بھی اسی میں شمار تھا۔ پھر غلامی کے عام رواج نے مالکوں کا ایک آرام طلب طبقہ پیدا کر دیا تھا، جو دوسروں کی محنت پر جیتا اور آرام کرتا تھا۔ غلام جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسلام نے سب سے پہلے غلامی کے خلاف آواز بلند کی۔ غلامی سے آزاد کرانا ایک اچھا فعل قرار پایا۔ لوگ روپیہ پیسہ دے کر بھی غلاموں کو آزاد کرادیا کرتے تھے۔ حضرت علیؑ نے ایک ہزار غلام خود اپنی کمائی سے آزاد کرائے۔ کاہلی اور کسل مندی کو بُرا بتایا اور محنت و مشقت سب پر لازم کی۔ جبر و تشدد سے آمدنی بڑھانا ناجائز قرار دیا اس طرح ہر استحصال پر ضربِ کاری لگائی۔

اسلام نے جائز اور حلال طریقے سے دولت کمانے پر کسی قسم کی روک نہیں لگائی۔ لیکن مال کو جمع کرنے اور سونے چاندی وغیرہ کی ذخیرہ اندوزی کو مردود قرار دیا اور بتایا کہ افراد اپنی ضرورت سے زیادہ جو مال پیدا کریں وہ اپنے کمزور افراد اور طبقات کی مدد پر صرف کریں۔ کیونکہ قرآن وحدیث میں زائد مال اربابِ احتیاج کا حق قرار دیا گیا ہے۔ غربا و مساکین کو ان کا یہ حق نہ دینا کفرانِ نعمت ہے۔ جمع مال کی ممانعت کی اس

توجیہ سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اسلامی سماج میں زیادہ دولت مند کی عزت نہیں ہے بلکہ اس کی عزت ہے جو غریبوں کی حالت سدھارنے میں خوش ہو کر حصہ لے۔ اسی کے ساتھ عیش پرستی اور فضول خرچی کی عام ممانعت کر دی گئی اور یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ اسلام کے پیشِ نظر صرف یہ ہے کہ دولت اور رزق معاشرے میں اس طرح مسلسل بٹتا رہے کہ اغنیا اور غربا کے درمیان بڑی خلیج حائل نہ ہونے پائے۔

ایسی مساوات اسلامی اور انصاف پر مبنی نظام قائم کیسے ہو؟ کیا حکومت یہ برابری عطا کر دیتی۔ یہ تو اسی وقت ممکن تھا جب حکومت ذرائع پیداوار کی مالک بن جاتی۔ اس کے لیے منظم صنعت کاری اور منظم معیشت کا وجود درکار تھا۔ قبائلی اور خانہ بدوش معیشت میں، بلکہ بعد کی زراعتی اور جاگیردارانہ معیشت میں بھی ایسا کرنا بے حد دشوار تھا۔ اسلام کی ترقی پسندی نے ایسے رہبرانہ اصول بنا دیے جن سے روشنی حاصل کر کے دنیا کو اشتراکیت تک کی طرف قدم اٹھانا ممکن ہو سکا۔ یہ سچ ہے کہ اشتراکیت اور اشتمالیت اپنے مادی فلسفے بالخصوص جدلیاتی مادیت کے تحت اس منزل پر پہنچی، لیکن اس کا دنیا اقرار کرے یا نہ کرے یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ مساواتِ انسانی اور دولت کی مساویانہ اور منصفانہ تقسیم کا ہر تصور اسلامی تعلیمات سے کسبِ نور کرتا رہا ہے۔ میرے کہنے کا یہ مفہوم ہرگز نہ نکالا جائے کہ اشتراکیت اسلام کی پیداوار ہے۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اسلام نے تیرہ سو برس پہلے ایک ترقی پسند نظامِ معیشت کی بنیاد نہ رکھی ہوتی اور کامیابی سے اُسے برت کے دِکھا نہ دیا ہوتا تو یورپ شاید برسوں اور تاریکیوں میں بھٹکتا رہتا۔ بہرصورت تاریخِ عالم وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔

چاہے عملی طور سے اس نظام کی سختی سے پابندی کم کی گئی ہو، لیکن صدرِ اسلام میں اس کے نمونے مل جاتے ہیں۔ یہاں حضرت علی کے دو مکتوبوں سے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جو آپ نے اپنے نائبین کو اپنے دورِ خلافت میں لکھے تھے۔ والیِ مکہ

قثم ابن عباس کو لکھتے ہیں:

۱) وَلَنْ یفوزَ بالخیرِ الاّ عاملُهُ وَلَایُجزی جَزاءَ الشئیِ الاّ فاعِلُهٗ... وَلَاتکُنْ عِندَ النعماءِ بَطِرا ولاعندَ الباساءِ فشِلاً۔ (نہج البلاغہ: رسائل:۳۳)

(بھلائی اسی کے حصے میں آتی ہے جو اس پر عمل کرتا ہے اور بُرا بدلہ اس کو ملتا ہے جو بُرے کام کرتا ہے..... اور نعمتوں کی فراوانی کے وقت کبھی اِتراؤ نہیں اور سختیوں کے مقابل بودا پن نہ دِکھاؤ۔)

ایک عامل کو لکھا:

۲) فَلَمّا امکنتكَ الشدةُ فِی خِیانةِ الاُمّة اَسرَعتَ الکَرَّةَ وَعاجلتَ الوثبَةَ وَاختَطفتَ مَا قَدَرتَ علیه مِنْ اموالِهم المَصونةِ لِاَرامِلِهم وَایتامِهم اختطافَ الذئب الازلِ دامِیةَ المعزی الکسیرةِ فَحَمَلْتَهٗ اِلی الحِجازِ رَحیبَ الصَّدرِ بحمایه غیرَ مُتأثِّمٍ مِن اَخذِهٖ کانك۔ لااَبالغیرك حدَرتَ الی اهلكَ تراثكَ مِنْ ابیكَ واُمِكَ... کیفَ تسیغ شرابًا وَطَعَامًا وَ انتَ تَعلَمُ اَنّكَ تاکُلُ حَرامًا وتشرَبُ حراماً وتبتاعُ الاماء وتنکحُ النساءَ مِن مَالِ الیتمیٰ والمَساکینَ وَ المؤمنینَ وَالمجاهدینَ الذین افاءَ اللّٰه علیهم هذهِ الاموال واَحرز بهم هذهِ البلاد۔ فَاتقِ اللّٰهَ وَ اردد اِلیٰ هؤلاءِ القوم اموالَهُمْ فَاِنّكَ اِن لَمْ تفعَلْ ثُم امکننی اللّٰهُ منكَ لاعذرنَّ الی اللّٰهِ فیك ولاضربنّكَ بسیفی الّذی ماضربت بهِ اَحَداً الّا دخلَ النار۔ (نہج البلاغہ: رسائل:۴۱)

(پس امت کے مال میں تمھیں بھرپور خیانت کا موقع ملا تو جھٹ سے دھاوا بول دیا اور جلدی سے کود پڑے اور جتنا بن پڑا اس مال پر جو بیواؤں اور یتیموں کے لیے محفوظ رکھا

گیا تھا یوں جھپٹ پڑے جس طرح پھرتیلا بھیڑیا زخمی اور لاچار بکری کو اُچک لیتا ہے اور
تم نے بہت خوش خوش اُسے حجاز روانہ کر دیا اور تمھیں اس پر احساسِ گناہ بھی نہ ہوا گویا کہ
یہ تمھارے ماں باپ کا ترکہ تھا جسے تم نے اپنے گھر والوں کی طرف بھیج دیا...... کیونکہ وہ
کھانا پینا تمھیں خوشگوار لگتا ہے جس کے بارے میں جانتے ہو کہ حرام ہے۔ تم ان
یتیموں، مسکینوں، مومنوں اور مجاہدوں کے مال سے جسے اللہ نے ان کا حق قرار دیا تھا اور
جن کے ذریعے سے ان شہروں کی حفاظت کی تھی، کنیزیں خریدتے ہو اور عورتوں سے بیاہ
رچاتے ہو۔ اب سے اللہ سے ڈرو اور ان لوگوں کا مال انھیں واپس کردو۔ اگر تم نے ایسا
نہ کیا اور اللہ نے مجھے تم پر قابو دے دیا تو اللہ کے سامنے اپنے کو سُرخرو کروں گا اور اپنی اس
تلوار سے تمھیں ضرب لگاؤں گا، جس کا وار میں نے جس پر بھی لگایا وہ دوزخ میں
سیدھے ہی پہنچا۔)

عثمان ابن حنیف والیِ بصرہ کو ایک خط میں تنبیہ کی:

۴) ولکن هیهات ان یَغلبنی هوایَ ویَقودنی جَشعِی الیٰ تخیرَ الاطعمة۔ وَلعَلَ بالحجازِ اَوالیَمامَة مَن لاطَمَعَ لهٗ فی القرص و لاعهدله بالشبع او ابیتَ مبطانا وحولی بُطون غرثیٰ وَاکباد حرّیٰ اَوَ اَکوُن کَماقال القائل وحسبُك داءً اَن تبیتَ ببطنةٍ وحولك اکباد تحنُّ الیٰ القدا۔ (نہج البلاغہ: رسائل:۴۵)

(لیکن ایسا کہاں ہوسکتا ہے کہ خواہشیں مجھے مغلوب بنالیں اور حرص مجھے اچھے کھانوں کو
چن لینے کی دعوت دے جب کہ حجاز و یمامہ میں شاید ایسے لوگ ہوں کہ جنھیں ایک روٹی
کے ملنے کی آس بھی نہ ہو اور انھیں کبھی پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہوا ہو۔ کیا میں شکم سیر ہو کر
کھالوں جبکہ میرے گرد و پیش پیٹ اور پیاسے جگر تڑپتے ہوں؟ یا میں ویسا ہو جاؤں جیسا

کہنے والے نے کہا ہے کہ تمھاری بیماری یہ کیا کم ہے کہ تم پیٹ بھر کر ابھی سے تان لو اور
تمھارے گرد ایسے جگر ہوں جو سوکھے چمڑے کو ترس رہے ہوں؟)

بعد کے علما اور فقہا نے بھی امیر یا رہبر کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ وہ ان
اصولوں پر اپنی سلطنتوں میں عمل کرائیں۔ سید علی زادہ حنفی نے فرائض امیر سے بحث
کرتے ہوئے لکھا ہے:

ولایدعُ فقیراً فی وِلایتهِ اِلَا اعطاهُ وَلا مَدیوناً اِلّا قَضاعنهُ دَینهٗ وَلاَ ضَعیفاً اِلاّ اَعانهُ وَلاَمظلُوماً الاتضره وَلا ظالماً اِلّا مَنعهٗ عَنِ الظُلمِ وَ لاَعاریاً اِلاّ کَساه کَسوةً (شرح حرمة الاسلام۔ اسلام کا اقتصادی نظام: ۳۱۔۳۰)

(اور امام کی ولایت کے اندر جب بھی کوئی فقیر سوال کرے تو امام عطا کرے اور قرضدار کا
قرض چکائے اور کمزور کی مدد کرے، مظلوم کی نصرت کرے، ظالم کو ظلم سے روکے اور جو
ننگا ہو اس کو لباس پہنائے۔) (شرح حرمة الاسلام بحوالہ: اسلام کا اقتصادی نظام: ۹)

اس سے یہ پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے کہ بھوکوں ننگوں اور محتاجوں کی اعانت یہ
حکومت کا فریضہ ہے۔ دنیا میں کتنی حکومتیں ہیں جو آج اکیسویں صدی کے آغاز کے
قریب بھی اس اعلیٰ معیار پر پورا اترنے کی کوشش کر رہی ہیں جو ابتدائے اسلام میں اس
عظیم نظام نے اپنا مطمحِ نظر قرار دیا تھا۔

ان عوامی، ترقی پسندانہ اور انقلابی نظریوں اور تحریکوں کی وجہ سے اسلام ایک
نقطۂ کشش بن گیا ہے اور رسول اللہ کی مرکزی شخصیت تمام توجہات اور عقیدت کا مرکز
بن گئی تھی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کی دوربیں اور حقیقت شناس نگاہوں نے یہ محسوس
کیا عقیدت کے اس جوشِ فراواں کو بھی حدوں میں رکھنا ضروری ہے۔ ایسی مثالیں تاریخِ
ماضی میں نایاب نہیں تھیں کہ غیر معمولی کامیابیوں پر لوگ اپنے ہیرو کی پوجا کرنے لگتے

تھے۔ یہ بنیادی تصورِ توحید کے منافی ہوتا اور اسلام کے ترقی پسندانہ تصورات کے بھی۔ حضرت علیؑ اور مخصوص معرفت شناس صحابہؓ کی بات اور تھی لیکن کم بیں عوام و خواص بھٹک بھی سکتے تھے۔ اس لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے اس کا بھی سدِ باب کیا۔

ذاتی پرستش کبھی نہیں

یہ بات تو پیغمبرِ اسلام اور قرآنِ کریم نے واضح کر ہی دی تھی کہ اسلام کی نظر میں مال و دولت کی عظمت نہیں۔ عظمت اچھے اعمال و کردار اور اچھے اخلاق و افکار کی تھی۔ آزاد، انسان جو خدا کے علاوہ کسی اور ہی وجود یا شے کے سامنے نہیں جھکے گا۔ غلام ہوگا تب بھی نہیں جھکے گا اور اللہ کے سامنے بادشاہ بھی جھکے گا اور عام انسان بھی۔ اللہ کی عبادت کے معاملے میں سب برابر ہیں۔ اللہ کی بارگاہ میں سب سے یکساں سلوک ہوتا ہے۔ وہ سب کا پالنے والا ہے، سب کا رزق دینے والا ہے۔ وہی سب سے بڑا ہے۔ بادشاہ سے بھی، رسول سے بھی، بتوں سے بھی، چاند تاروں سے بھی، زمین و آسمان سے بھی۔ اس کے سامنے اونچ نیچ کا کیا سوال:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اسلام کی نگاہ میں بندہ نواز تو صرف خدا ہے۔ پھر انسان کی بزرگی کا معیار انسان کا اللہ کے احکام کی پابندی اور جن باتوں سے اس نے روکا ہے ان سے پرہیز۔ کیونکہ اس کے اوامر و نواہی انسان ہی کے ذاتی اور جماعتی فائدے کے لیے ہیں۔ قرآنِ کریم نے بزرگ انسان کی پہچان یہ بتادی کہ جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہوگا وہی سب سے زیادہ بزرگ بھی ہوگا۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ (الحجرات:۱۳) رسول اس اعتبار سے بھی بزرگ تھے۔ دوست دشمن سب ان کے حسنِ اخلاق کے قائل تھے۔ جب

اسلامی تعلیمات کی اہمیت عام لوگوں پر واضح ہونے لگی تو دنیاوی نگاہوں میں بھی بزرگی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کے قدم چومنے لگی۔ وہ دن بھی آ گیا کہ لوگ چشم و ابرو کے اشارے پر چلنے کو سعادت سمجھنے لگے۔ اب یہ خطرہ سامنے آیا کہ مال کا تفاخر کہیں ذاتی فخر میں تبدیل نہ کر دیا جائے اور جو شہرت، بزرگی فتح، کامیابی اور ترقی اسلامی پیغام کی عظمت کی بدولت حاصل ہو رہی تھی اسے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کی ذاتی پرستش کی شکل نہ دے دی جائے۔ اس سے پہلے دنیا دیکھ چکی تھی کہ نصرانی انحراف پسندوں نے کس طرح حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا قرار دے لیا تھا اور روح القدس کو شامل کر کے وحدانیت کو تثلیث میں بدل دیا تھا اور اس طرح ذاتی پرستش کی راہیں کھول دی تھیں۔ خدا کی حیثیت ثانوی ہوگئی تھی۔ مجوسیت جس بت پرستی کو مٹانے کی دعویدار تھی، وہ ایک نئے روپ میں ظاہر ہو چکی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کو ایسی ذاتی شہرت اور دنیاوی بڑائی سے نفرت تھی جو توحید کے بنیادی مقصد سے ٹکرائے اور شرک کے دروازے کھول کر انسان کو پھر نئی غلامی میں مبتلا کر دے۔ اسلام نے اس خطرے کا کلیتہً انسداد کرنا چاہا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ نے قرآنِ کریم کے لفظوں میں یہ اعلان فرمایا کہ ''میں تمھاری ہی طرح بشر ہوں (لیکن ایسا بشر کہ) مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔'' (اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ یُوحیٰ اِلَیَّ۔) عبدیت کے معاملے میں اور بشریت کے عمومی تقاضوں کے مسئلے میں آپ دوسرے انسانوں کی طرح تھے۔ فرق یہ تھا کہ آپ امینِ وحیِ الٰہی تھے اور صاحبِ معراج تھے۔ صدق و خلوصِ عمل، پرہیزگاری، نیکوکاری، خوش اخلاقی، اعلیٰ درجے کی قائدانہ صلاحیت اور مصلحانہ اتحاد پسندی کی بدولت، منشائے ربانی کے مطابق آپ نے قربِ الٰہی کی وہ منزل پائی جسے قرآنِ کریم کی اصطلاح میں ''دو کمانوں یا اس سے بھی کم'' قَابَ قَوسَینِ أو أدنیٰ۔ سے تعبیر کیا گیا۔

اسلامی پیغام ویسے تو پہلے پہل اہلِ مکہ کو سنایا گیا، لیکن اس کی آفاقیت نے اسے جلد ہی دور دور تک پھیلا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں نے پہلے پہل حبشہ کی

طرف ہجرت کی تو شاہِ حبش کو اس پیغام میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ اس پیغام کی آفاقی خوبیاں اس منزل سے ظاہر ہونے لگی تھیں، جو مکہ والوں کے لیے تھا وہی مدینہ اور یمن والوں کے لیے بھی تھا اور جہاں جہاں یہ پیغام پہنچایا گیا وہاں سے لبیک کی صدائیں اٹھتی رہیں۔ مخالفت میں تنگ نظر مکہ والے پیش پیش تھے، کیونکہ انھیں اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ کعبہ میں ہر مذہب ہر قبیلے کا بُت تھا۔ اس کی پرستش کے لیے لوگ دور دور سے آتے، تجارت کا سامان بھی لاتے اور چڑھاوے بھی چڑھاتے۔ مکہ کی ساری مرکزیت کعبہ کے بزرگ بُت خانے کی وجہ سے تھی۔ بُت نہ رہیں گے تو کعبہ اور مکہ کا کیا ہوگا؟ انھیں کیا خبر تھی کہ وحدانیت کا نشان بن کر کعبہ صحیح معنوں میں عظیم اور ساری دنیا کی نگاہوں کا محور بن جائے گا۔

رسول ذاتی پرستش کرانے کے خواہش مند ہوتے تو اپنی شخصیت کی مالی اور دنیاوی حیثیت بنانے اور سنوارنے کی کوشش کرتے، لیکن وہ عام مسلمانوں کی طرح فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے رہے۔ سارے کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے تھے۔ محنت و مشقت سے خود بھی پرہیز نہیں کرتے تھے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتے رہتے تھے بلکہ دوسروں کے پہلو بہ پہلو کام کرتے تھے۔ وہ ساری کائنات کے لیے ہادی، رہبر اور نیک عمل کا نمونہ بن کر آئے تھے۔ ہر رسول اسی پیکر میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ بتانا ضروری تھا کہ بزرگی اسی نیکی عمل کی راہ پر چل کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ بے عملی، جوگ اور تیاگ کی راہ الگ ہے۔ یہ راہ انسان کو بلندیوں تک نہیں لے جاسکتی۔ بزرگی اور بلندی مال و منال یا شہرت اور دنیاوی عہدوں سے نہیں ہے۔ استحصال اور بادشاہت سے نہیں ہے۔ مرضیِ قدرت یہی ہے کہ انسان اچھی اور صاف ستھری زندگی بسر کرے۔ رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اُن نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو جو اس کے لیے دنیا میں فراہم ہیں اور جن کا ذکر قرآنِ کریم کی آیتوں، رسول کی حدیثوں اور ائمہ کے اقوال میں آتا ہے۔ بزرگی کی یہ راہ جدوجہد کی، ترقی کے لیے دنیا کو تسخیر کرنے، دوسرے کے دُکھ درد

میں کام آنے اور اجتماعی بہبود کی راہ ہے۔ بزرگی کا یہی راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ، آپ کے اہلِ بیت اطہار اور خاص احباب و اصحاب نے اپنایا۔ شدائد جھیل کر کارواں کو آگے بڑھایا اور اہلِ کارواں کو یہ جتلا دیا کہ اسلام میں سرفرازی، سُرخروئی اور سربلندی اوپر سے عائد نہیں ہوتی بلکہ اس کو خشت بہ خشت تعمیر کرنا پڑتا ہے بلکہ اسلامی راہبر کو خود بھی مشکلوں اور دشواریوں کے راستے پر چلنا پڑتا ہے۔

اسی وجہ سے اسلام میں ان بزرگوں کی سیرت اور سنت کو اتنی اہمیت حاصل ہے۔ وہ ماننے والوں کے ساتھ گھل مل کر رہ رہے تھے، اُن کے اہلِ بیت گھر کا سارا کام کاج خود کر رہے تھے۔ ذاتی پرستش کے آرام سے ان سب کو نفرت تھی۔ یہ بتانا مقصود تھا کہ جو راستہ بتایا جارہا ہے وہ سراسر قابلِ عمل بھی ہے، جن مختلف ذرائع سے مال اور تفاخر کی نفی کی گئی اُن میں یہ بھی تھا کہ زیردستوں، کمزوروں، غریبوں اور خستہ حالوں پر مرحمت کچھ زیادہ ہی رہی۔ نسل و نسب کو بالکل ثانوی حیثیت دے دی گئی۔ غرض جو معاشرہ زیرِ تعمیر تھا اس کی ہر بات میں تازگی اور شگفتگی تھی۔

حاصل کلام

اسلامی ترقی پسندی کا ایک مختصر سا خاکہ پچھلے اوراق میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کسی طرح جامع و مانع تو نہیں ہے، لیکن کئی اہم پہلو فکر کے تسلسل کی کڑی میں ملا کر سامنے لائے گئے ہیں تاکہ فکرِ اسلامی کے بنیادی تصورات موجودہ عصری تقاضوں کی روشنی میں سامنے آجائیں۔ اسلام کی تعلیمات زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کرتی ہیں اور ان چودہ سو برسوں کی مدت میں خود زندگی بہت سی تبدیلیوں سے دوچار ہو چکی ہے۔ اس پھیلاؤ اور تنوع کو ایک مختصر سے رسالے میں سمیٹنا ناممکنات میں سے ہے۔ میں نے اپنے سامنے ایک محدود نشانہ رکھا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلام تاریخ کے جس تاریک دور میں نمودار ہوا اُس میں یہ اپنے جلو میں کیا کیا خوش گوار اور ترقی پسندانہ تبدیلیاں لایا۔ کوئی بھی غیر جانب دار قاری یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اب سے کچھ کم ڈیڑھ ہزار برس پہلے اسلام نے جو نظامِ فکر وعمل پیش کیا تھا وہ اس دور کے حالات اور ضروریات کو دیکھتے ہوئے ترقی پسندانہ ہی نہیں بلکہ انقلابی بھی تھا۔

ترقی پسندی کی بات آتے ہی ذہن مارکسیت کی طرف جاتا ہے۔ مولانا حسرت موہانی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ 'سویٹ' دراصل عربی سویّت ہے جو اسلامی ذرائع سے روس پہنچا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کا یہ خیال خوش اعتقادی پر مبنی تھا یا اس کے پس پشت

تحقیق کی روشنی بھی تھی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ڈھونڈنے والے سوشلزم اور اسلام میں مماثلتیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ میرا طریق کار اس سے مختلف رہا ہے۔ میں ایک یا دوسرے اِزم کے چکّر میں نہیں پڑا ہوں، کیوں کہ اسلام ان سے پہلے وجود میں آچکا تھا۔ میں نے صرف یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ اُس وقت کے معاشرے اور معیشت میں اسلام نے کن کن سمتوں میں ترقی کا قدم اٹھایا۔ اہم اقدامات کی فہرست خاصی طویل اور قابلِ توجہ ہے۔

سب سے بڑا انقلابی نعرہ اسلام نے یہ دیا کہ زمین اور مُلک اللہ کا ہے۔ مالک حقیقی وہی ہے۔ اس نعرے نے بادشاہوں سے لے کر چھوٹے موٹے زمین مالکوں تک کی اکڑفوں خاک میں ملادی۔ وہ کس چیز پر ناز کرتے ہیں؟ مالک تو کوئی اور ہی ہے۔ زمین پر انسان اس کا نائب ہے تو اس پر لازم ہوا کہ وہ انصاف برتے اور ظلم و جبر سے احتراز کرے۔ اس کے علاوہ محنت و مشقت لازم قرار دی گئی۔ اس نیابت میں اُس تولیت کے نظریے کے ابتدائی نقوش دیکھے جاسکتے ہیں جو گاندھیائی، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی فلسفے کی شکل میں تیرہ سو برس بعد نمودار ہوا۔ انھوں نے سرمایہ دار کو مزدوروں کے حقوق کا متولی قرار دیا تھا۔ انھوں نے اس اخلاقی تولیت کو نیابت الٰہی کی ایک شکل سمجھا۔ یہ اسلام ہی کی لچک دار ترقی پسندی کا نتیجہ ہے کہ ایران، شام، لیبیا، عراق اور الجزائر وغیرہ میں ایسے نظاموں کی گنجائش نکالی گئی جن میں اسلامی مساوات اشتراکی ترقی پسندی کے شانہ بشانہ بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ دیکھیں اس تازہ تگ و دو میں اسلامی ترقی پسندی دنیا کو اور کیا تحفے دیتی ہے۔

یہ بات مزید صراحت چاہتی ہے کہ اسلام انفرادی ملکیت کا مخالف نہیں رہا ہے۔ اس نے ذاتی ملکیت کی اجازت شرط و شروط کے ساتھ دی ہے۔ یعنی مطلق العنانی نہیں ہے، بلکہ یہ ملکیت ایک امانت خداوندی ہے جسے مالک متولی کی حیثیت سے استعمال کر رہا ہے اور ہوش مندی کے ساتھ یہ محسوس کر رہا ہے اس میں کاشتکار اور مزدور

ہی نہیں بلکہ زیردستوں کا بھی حصہ ہے۔ کم ہی اسلامی ممالک ہوں گے جہاں اس نظریے
کو قانون کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہوگی۔ اس طرف نئے دور کے مفکرین
کو سوچنے کی ضرورت ہے۔ اشتراکی ممالک میں شخصی ملکیت کی افادیت پر ازسرِ نو غور
ہونے لگا ہے، اس لیے ترقی پسند حلقوں میں یہ خیال شجرِ ممنوعہ نہیں رہ گیا ہے۔ اب سوال
یہ اٹھتا ہے کہ شخصی ملکیت اور مفادِ عامہ میں ربط کس طرح قائم کیا جائے۔

دوسرا انقلابی قدم جو اسلام نے اٹھایا وہ آزادیٔ نسواں کا تھا۔ اب ساری دنیا
نے اس ترقی پسند اقدام کو قبول کرلیا ہے۔ لیکن آج کی دنیا میں اس مسئلے نے افراط وتفریط
کو بھی جنم دیا ہے۔ ایک طرف تو آزادیٔ نسواں بے راہ روی کا لائسنس بن گئی ہے اور
اپنے جلو میں نفسیاتی امراض اور بے شادی کے بچوں کی پیدائش، طلاقوں کی گرم بازاری
وغیرہ لائی ہے جس سے یورپ اور امریکا کا ترقی زدہ طبقہ نبرد آزمائی کی کوشش کر رہا
ہے۔ بحیثیت ایک ادارے کے خاندان کا شیرازہ بکھر چکا ہے لیکن اس میں بہت کچھ
الزام صنعتی دور کی لائی ہوئی زندگی کے سر بھی جاتا ہے۔ دوسری طرف دنیا کے مختلف
گوشوں میں عورت اب بھی عام حقوق سے عاری اور کنیزی زندگی بسر کرنے پر اپنے کو
مجبور پا رہی ہے۔ اس افراط وتفریط کے مابین چودہ سو برس پہلے نکالی ہوئی اسلامی میانہ
روی کی وہ ترقی پسندانہ راہ ہے، جو اُس زمانے کی پسماندگی کو دیکھتے ہوئے یقیناً انقلابی
تھی۔ اس رو میں عورت کو زندہ اور باعزت زندہ رہنے کا حق ملا، ورنہ کئی ملکوں میں تو اُسے
زندہ دفن ہی کردیا جاتا تھا یا مندروں وغیرہ پر زندگی بھر کے لیے چڑھا دیا جاتا تھا۔ پھر
شادی میں اس کی رضامندی لازمی قرار دی گئی۔ گذشتہ سماجوں نے مردوں کو جو لاتعداد
شادیوں کی اجازت دے رکھی تھی وہ منسوخ ہوئی اور سیکڑوں اور بیسیوں سے یہ تعداد گھٹا
کر چار میں محدود کردی گئی۔ وہاں بھی عدل کی شرط لگادی گئی۔ تعدّد کی اجازت کے سلسلے
میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آئے دن کی جنگوں کی وجہ سے اُس زمانے میں مردوں کی تعداد

عورتوں کے مقابلے میں کم ہوگئی تھی۔ طلاق کے علاوہ اُسے حقِ خلع بھی ملا۔ سب سے
بڑھ کر یہ کہ اس کا حقِ وراثت تسلیم کیا گیا۔ اسی کے ساتھ عورتیں اپنی محنت سے جو کچھ
کماتیں اس پر اُن کا پورا حق ہوجاتا۔ پہلے کی طرح شوہر یا ماں باپ اس کے مالک نہ
ہوتے۔ علم کے معاملے میں اس کا مساوی حق تسلیم کیا گیا۔ زندگی کی جدوجہد میں اس کو
باعزت شریکِ کار کا رتبہ ملا۔ دنیا میں قانونی اور اخلاقی طور پر عورت پہلی بار آزاد ہوئی۔
یہ اسلام کی ترقی پسندی کا ایک زریں اور تابناک ورق ہے۔

پیش رو معاشروں میں ظلم وتعدّی اور استحصال عام تھا۔ ہر طرف فتنہ وفساد پھیلا
ہوا تھا۔ قتل وغارت کا بازار گرم تھا اور امن اجنبی مسافر کی طرح بھٹکتا پھرتا تھا۔ کوئی نظام
ان حالات میں استوار نہیں رہ سکتا تھا۔ سب سے پہلے ان حالات کو بدلنا تھا۔ اس کے
لیے فکری تبلیغ اور جہادِ نفس دونوں کرنا پڑا۔ جیسے جیسے تحریک آگے بڑھتی گئی ظلم اور جور کا
کھل کر مقابلہ بھی لازم ہوا۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ کا یہ حصہ انسانی ترقی کی عالمی تاریخ
میں ایک جگمگاتا ہوا باب ہے۔ یہ کہانی آج بھی دلوں کو گرماتی اور ذہنوں کو تازگی بخشتی
ہے۔ دولت کی تخلیقی اور تعمیری پیداوار، اضافہ اور مساویانہ وعادلانہ تقسیم فتنہ وفساد کی
فضا میں ممکن نہیں ہوسکتی۔ اس لیے قرآنِ کریم میں بار بار عدل وانصاف، احسان وایثار،
محبت واخوت کا حکم دیا گیا ہے۔ رنگ، نسل، قوم، قبیلہ کی طرح کی تفریقوں، ذات پات
کے فرق، اور اونچ نیچ کے امتیاز کو بے بصیرتی پر محمول کیا گیا ہے اور اس سے احتراز کو
اسلامی طریقہ بتایا گیا ہے۔ یتیموں، محتاجوں، غریبوں اور بیواؤں کی خبرگیری، عرب کے
بے آب وگیاہ میدانوں میں مسافرنوازی کو اسلامی اخلاقِ حسنہ کا اہم ستون قرار دیا گیا
اور سنتِ رسولؐ کی شکل میں اس کو بے حد عملی ثابت کردیا گیا۔ اسی کے ساتھ فضول خرچی
اور بخل کو برا کہا گیا کیوں کہ دونوں صورتوں میں مستحق کی بجائے غیر مستحق کو مال پہنچتا ہے،
جو فضول خرچی کرتا ہے، ایک بے جا کام پر روپیہ بہاتا ہے۔ یہی روپیہ کسی مستحق تک پہنچتا

یا کسی نیک کام میں صرف ہوتا۔ جو کنجوسی کرتا ہے وہ بھی مستحق تک حق پہنچانے میں رکاوٹ ڈالتا ہے اور زر و مال جمع کر کے نمائش اور استحصال کو فروغ دیتا ہے اور تقسیم بالسویہ کے اسلامی نظام کو نقصان پہنچاتا ہے۔ قرآن کریم نے فضول خرچی کرنے والوں کی شدید مذمت کی ہے:

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيراً ٥ اِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوٓا اِخوانَ الشَّيَاطِيْن ؕ

(بنی اسرائیل: ۲۷-۲۶)

(فضول خرچی ہرگز نہ کیا کرو کیوں کہ فضول خرچ کرنے والے بے شبہ شیطان کے بھائی ہیں۔)

ان معنوں میں دولت اور تنگی دونوں ہی ایک طرح کا امتحان ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کو یوں کہا گیا ہے:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَاابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ٥ وَ اَمَّآ اِذَامَاابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ٥ كَلَّا بَلْ لَّاتُكْرِمُوْنَ الْيَتِيمَ ٥ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ٥ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ٥ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ٥ (الفجر: ۲۰-۱۵)

(لیکن جب انسان کو اُس کا پروردگار اس طرح آزماتا ہے کہ اس کو عزت و نعمت دیتا ہے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت دی ہے، لیکن جب یوں آزماتا ہے کہ اس پر روزی کو تنگ کر دیتا ہے تو کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کیا۔ ہرگز نہیں بلکہ تم لوگ نہ یتیم کی خاطر داری کرتے ہو اور محتاج کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو اور میراث کے مال کو سمیٹ کر چٹ کر جاتے ہو اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔)

غرض اسلام نے کوئی موقع کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں عامۃ الناس اور

محتاجوں اور زیر دستوں کی فلاح کا انتظام نہ کیا ہو۔ حضرت علیؑ کے ایک ارشاد سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ایک عادلانہ سماج میں کسی کو بھوکا ننگا نہیں رہنا چاہیے۔ سماج میں فساد کا ایک بہت بڑا سبب دولت کی نا برابر تقسیم ہے اور اسلام نے اس کو ابتدا ہی سے محسوس کر کے فتنہ و فساد کی جڑ کو اُکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ فتنہ پردازی بھی اسلام میں ایک بڑا جرم مانی گئی ہے۔ سورۂ توبہ میں آیا ہے کہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْل (فتنہ و فساد قتل سے بھی بدتر ہے) غرض ہر اعتبار سے ایک صالح، پرامن، ترقی پسند معاشرہ کی تشکیل اسلام کا مطمحِ نظر رہا ہے۔ اس کا طرّۂ امتیاز یہ ہے کہ اس نے ان خطوط پر اس وقت باقاعدگی سے سوچا جب ساری دنیا خواب غفلت میں تھی۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان تعلیمات کو خود اپنے معاشرے میں سنبھالے رکھنے میں کوتاہی برتی گئی اور ایک جمود کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ان صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصد سوتوں کو جگانا نہیں، بلکہ نئے خطوط پر سوچنے کی ترغیب دینا ہے۔

علی جواد زیدی کی دیگر تصانیف

شعری مجموعے

۱) رگِ سنگ (۱۹۴۴ء) ۲) میری غزلیں (۱۹۵۹ء)
۳) دیارِ سحر (۱۹۶۰ء) ۴) انتخابِ علی جواد زیدی (۱۹۷۱ء)
۵) نسیمِ دشتِ آرزو (۱۹۸۰ء) ۶) تیشۂ آواز (۱۹۸۵ء)
۷) سلسلہ (۱۹۹۰ء)

تحقیق و تنقید

۱) اردو میں قومی شاعری کے سو سال (۱۸۵۷ء۔۱۹۵۷ء) (۱۹۵۷ء)
۲) اردو میں قومی شاعری کے سو سال (مع اضافہ) (۱۹۸۱ء)
۳) ہماری قومی شاعری (۱۹۳۰ء تک) (غیر مطبوعہ)
۴) تعمیری ادب (۱۹۵۹ء)
۵) انوارِ ابوالکلام آزاد (۱۹۵۹ء)
۶) دو ادبی اسکول (۱۹۷۰ء)
۷) ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز (۱۹۷۲ء)
۸) فکر و ریاض (۱۹۷۵ء)
۹) تاریخ ادبِ اردو کی (۱۹۷۶ء)
۱۰) قصیدہ نگارانِ اترپردیش (۱۹۷۸ء)
۱۱) تاریخ ادب کی تدوین (۱۹۸۰ء)
۱۲) دو ادبی اسکول (دوسرا ایڈیشن) (۱۹۸۰ء)
۱۳) دیوانِ غنی (تعارف و مقدمہ) (۱۹۶۴ء)
۱۴) ذکر و فکرِ غنی (مجموعۂ مضامین) (۱۹۶۶ء)

۱۵) قصیدہ نگارانِ اترپردیش (دوسرا ایڈیشن) (۱۹۸۳ء)
۱۶) مثنوی نگاری (۱۹۸۵ء)
۱۷) اترپردیش میں نعت نگاری (غیر مطبوعہ)
۱۸) اترپردیش میں نثر نگاری (غیر مطبوعہ)
۱۹) دو ادبی اسکول (مع اضافہ، مطبوعہ پاکستان) (۱۹۸۸ء)
۲۰) کمالِ ابوالکلام آزاد (مجموعۂ مضامین) (۱۹۸۹ء)
۲۱) میر انیس (ہندی میں) (۱۹۶۹ء)
۲۲) غالب ایک پریچے (ہندی میں) (۱۹۶۹ء)
۲۳) مالک رام ایک نذرانۂ عقیدت (۱۹۷۲ء)
۲۴) تاریخ مشاعرہ (۱۹۹۲ء)
۲۵) مالک رام ایک مطالعہ (۱۹۸۷ء)
۲۶) اسلامی ترقی پسندی (۲۰۰۸ء)
۲۷) دہلوی مرثیہ گو (پہلا ایڈیشن) (۱۹۸۲ء)
۲۸) دہلوی مرثیہ گو (دوسرا ایڈیشن) (۱۹۸۷ء)
۲۹) انیس کے سلام (۱۹۸۵ء)
۳۰) رباعیاتِ انیس (۱۹۸۷ء)
۳۱) میر انیس (انگریزی میں) (۱۹۸۶ء)
۳۲) میر انیس (اردو میں) (۱۹۹۱ء)
۳۳) جدید مرثیہ کے بانی میر ضمیر لکھنوی (۱۹۹۹ء)
۳۴) ادبیاتِ کشمیر (۱۹۹۴ء)
۳۵) آپ سے ملیے (۱۹۹۳ء)
۳۶) ہم قبیلہ (۱۹۹۰ء)
۳۷) اہلِ قبیلہ
۳۸) یادوں کی رہ گزر (غیر مطبوعہ)
۳۹) متاعِ نظر (غیر مطبوعہ)

۴۰) انتخابِ رند (۱۹۸۳ء)
۴۱) سرودِ ہم سایہ (۱۹۸۵ء)
۴۲) پیامِ آزادی (۱۹۴۷ء)
۴۳) نغمۂ آزادی (۱۹۵۷ء)
۴۴) نغمۂ آزادی (ہندی میں) (۱۹۵۷ء)
۴۵) مہاتما گاندھی (انگریزی سے ترجمہ) (۱۹۸۶)
۴۶) دیوانِ شمس تبریزی (فارسی سے ترجمہ)
۴۷) پارو (ایک منظوم افسانہ) (۲۰۰۵ء)
۴۸) نذرِ عقیدت (مجموعۂ قصائد) (غیر مطبوعہ)

نامکمل تصانیف

۱) رام کتھا اردو میں (غیر مطبوعہ)
۲) علی ابنِ طالب
۳) غبارِ کارواں

Books published in English

1) A History of Urdu Literature (1993)
2) Mir Anees (1986)
3) The Prophet's Daughter (Unpublished)
4)An Experiment in Communication Planning (1970) (Research paper)
5) Human Interest Stories (1970) (Research paper)

6) Urdu Press in Bihar and Bengal (1978) (Research paper)
7) Mortality and Growth in Urdu Press (1978) (Research paper)
8) All India Student's Conference Golden Jubilee Celebrations (Report)

حرفِ آخر

والد محترم کیا نتقال کے بعد صدمے کے ساتھ ساتھ میرے دل میں ایک ذمہ داری کا احساس بھی جنم لینے لگا۔ میں جب بھی لکھنؤ جاتا انکل ان مسودوں کا ذکر کرتے جو شائع نہیں ہوئے تھے یا نامکمل تھے۔ میں ان کے بارے میں سوچتا تو مجھ میں یہ احساس جاگتا کہ ان کے نامکمل رہ جانے یا نہ چھپنے کی وجہ سے ان کی روح کو تکلیف پہنچتی ہوگی۔ اس احساس نے میرے دل میں اس ارادے کو پختہ کیا کہ میں ان کو شائع کردوں۔

والد صاحب کی زندگی کے آخری دو سالوں میں ان کی بینائی تقریباً جا چکی تھی اس سبب سے ان کا کہیں آنا جانا یا لوگوں سے ملنا جلنا ختم سا ہو گیا تھا۔ اس حالت میں بھی انھوں نے کوئی وقت ضائع نہ جانے دیا اور اپنے غیر مطبوعہ اور نامکمل مسودوں کو کاتب کی مدد سے مکمل کرنے میں لگے رہے۔ غیر مطبوعہ تکمیل شدہ کتابوں کی اشاعت کی انھیں مہلت نہ ملی اور بعد میں کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کاش مجھے یہ احساس پہلے ہی ہو چکا ہوتا۔ اللہ کا کرم ہے کہ جب میں نے اس کام کی انجام دہی کا بیڑہ اُٹھایا تو چند کرم فرماؤں نے میرا ساتھ دیا اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس طرح ان کی پہلی غیر مطبوعہ کتاب "پارو" ۲۰۰۵ء میں شائع ہوسکی۔ یہ کتاب "اسلامی ترقی پسندی" والد صاحب کے انتقال سے تقریباً دو برس پہلے ہی مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ وہ دوسری کتابوں کی تکمیل میں مصروف تھے اس لیے یہ شائع نہ ہو پائی۔

حالاں کہ انھوں نے کئی بار اس کی اشاعت کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میرے خیال میں آج کل دنیا میں اسلام اور اسکی تاریخ کو مسخ کر کے جس طرح بدگمانی پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اس کتاب کی اشاعت بہت مناسب اور موزوں ہے۔ اسی لیے میں نے اسے ترجیح دی۔ یہ کام الیاس شوقی، مولانا احمد علی اور مولانا ظہیر عواس رضوی صاحبان کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ میں ان کا اور دیگر تمام احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی مدد کے بغیر یہ میرے لیے ممکن نہ تھا۔

انور زیدی

دلوں سے آج خیالِ نمود و بود گیا
صلیب پر کوئی پڑھتا ہوا درود گیا